مجموعۂ کلام

نظامی بدایونی

مولانا نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی

ایڈیٹر اخبار ذوالقرنین

کے

کلام کا مجموعہ

مرتبہ

احید الدین نظامی
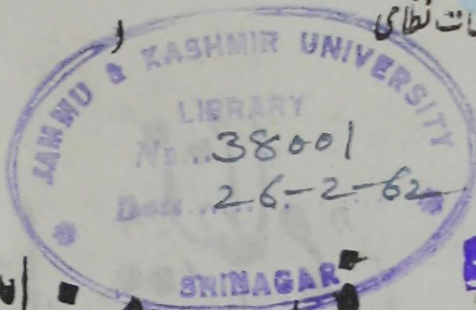
سنہ ۱۹۵۵ء

قیمت عہ

فہرست مضامین
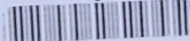
...ضیاء الدین ایف۔ آر۔ ایس۔ اے لندن۔ پرنٹر و پبلیشر
مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

عرض ناشر

میں اپنے شفیق باپ اور بزرگ خاندان کی نظموں، غزلوں، سہروں اور نوحوں کا ایک ایسا مجموعہ پیش کر رہا ہوں جو میرے والد مولانا نظام الدین حسین نظامی کے خیالات اور جذبات کا آئینہ ہے مجھے اس سے بحث نہیں کہ ان کی اس جذباتی شاعری کی شعر و سخن کے بازار میں کیا قیمت اور وقعت ہوگی بلکہ میرا اصلی منشاء یہ ہے کہ جہاں لوگوں نے اخبارات میں ان کے مضامین پڑھ کر یا ان کی دیگر ادبی تصانیف کا مطالعہ کر کے ان کے خیالات اور جذبات کا اندازہ کیا ہے اُن کے سامنے اس مختصر مجموعہ کو پیش کر کے اور زیادہ موقع دوں کہ وہ ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے کچھ زیادہ نزدیک ہو جائیں والد مرحوم کی زندگی میں اسی طرح کا ایک اور مجموعہ ۱۹۳۰ء میں تجلیات سخن کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے اپنا اس وقت تک کا کلام شائع کر دیا تھا لیکن آج نایاب ہے اس کے بعد کا کلام مجھے اب دستیاب ہو سکا اس کو میں نے یکجا کر دیا ہے اور آج وہ لمعات نظامی کے نام سے آپ کے پیش نظر ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ والد مرحوم کے ایک مخلص دوست حضرت شیام موہن صاحب جگرؔ بریلوی جو ملک کے ایک ممتاز شاعر ہیں اور مشہور ادیب بھی ہیں انہوں نے باوجود اپنی پیرانہ سالی اور ناساز طبیعت کے اپنی محبت اور خلوص کی بنا پر میری درخواست پر ایک مختصر تعارف نامہ لکھ دیا ہے جس کے لئے میں بے حد احسان مند ہوں۔

احید الدین نظامی

۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء

تعارف

زندگی وہ جو کسی رنگ کا پیماں ہو جائے
آدمی وہ جو کسی حسن پہ قرباں ہو جائے

مولانا نظام الدین حسن نظامی مرحوم ۱۸۷۳ء میں بدایوں کے اُس معزز و مشہور خاندان میں پیدا ہوئے جو سلاطین مغلیہ کے زمانے سے متولی خاندان کہلاتا ہے۔ اُردو فارسی کی ابتدائی تعلیم آپ کے والد مرحوم مولانا فخر الدین بدایونی کی نگرانی میں ہوئی۔ ۱۸۹۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا تلاش معاش نے سرکاری ملازمت پر مجبور کیا مگر آزاد طبیعتیں بندگی و بیچارگی کی دشواریاں نہیں برداشت کرسکتیں۔ سات آٹھ سال بعد مستعفی ہو گئے۔ بدایوں میں نظامی پریس کھولا اور ۱۹۰۳ء میں اپنا اخبار ذو القرنین نکالا۔ اس وقت پریس اور اخبار دونوں مرحوم کے فرزند رشید مولوی احید الدین نظامی کے زیر نگرانی خوش اسلوبی سے چل رہے ہیں۔ ۸ رجون ۱۹۴۷ء کو مولانا نے ۷۴ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اس عمر کے ماہ و سال اور شب و روز کس طرح گزرے ذرا تشریح طلب ہے۔

مولانا مرحوم کوئی لیڈر نہ تھے جس کا مقصد حیات قومی نمایندگی کے انتخابات میں فتح حاصل کرنا اور فتح کے بعد سونے کے محلات تعمیر کرلینا ہوتا ہے ایسے محلات جو پشتہا پشت تک خسروانہ عیش و آرام کے کفیل و ضامن رہیں اور کیوں نہ ہو چار دن کی زندگی میں ایسے موقع بار بار نہیں آتے وہ کوئی ملک التجار نہ تھے جن کے آگے حکومتیں سر جھکا دیتی ہیں۔ وہ کوئی یگانۂ روزگار

شاعرنہ تھے جو شاگردوں کی پلٹن تیار کرنے اور اپنا نقارہ بجانے میں شب و روز منہمک رہتے ہیں وہ ایک سادھارن انسان تھے لیکن ایسے انسان جو اپنی قوم کے سچے سپوت اور سوسائٹی کے زیور ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں اپنی قوم کی تیرہ روزگاری کا غم تھا۔ اس غم سے انہوں نے ایسا عہد باندھا جو عمر کے ساتھ ساتھ پختہ تر ہوتا گیا۔ اس عہد و پیمان کے خاص پہلو تھے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور ان کی اقتصادی حالت کو درست کرنا۔ وہ زندگی بھر بڑے انہماک کے ساتھ ان دونوں کاموں میں مصروف رہے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ کو کامیاب بنانے میں تمام عمر سرگرم کار رہے۔ اٹھارہ سال تک پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری رہے سنہ ۱۹۱۶ء میں مرحوم کی مسلسل کوششوں اور تدبیروں سے بدایوں میں اسلامیہ ہائی اسکول کا سنگ بنیاد رکھا گیا جس کے لئے شہر کے معززین اور رؤسا نے گرانقدر عطیہ زمین اور جائدادیں دیں۔ اب یہ اسکول حافظ صدیق اسلامیہ انٹر کالج کہلاتا ہے۔ پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعہ مرحوم نے گورنمنٹ کو توجہ دلائی کہ مسلمانوں کی تعلیمی کمیٹی کو چھوٹے بچوں کے لئے اسلامیہ مکاتب کھولکر مدد دیجائے چنانچہ یہ کام بھی ہوگیا۔ بدایوں کی اسلامیہ مکتب کمیٹی کے عرصہ تک آنریری سکریٹری رہے۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں کانگریس گورنمنٹ نے ایجوکیشن ریکمنڈیشن کمیٹی

Education recommendation Committee

کا تقرر کیا مرحوم نے اسکے ممبر کی حیثیت سے مسلمانوں کے تحفظ حقوق کیلئے بیش بہا خدمات انجام دیں مسلم یونیورسٹی کے قیام و بہبود کے لئے مسلسل مضامین لکھے اور پمفلٹ بھی شائع کئے۔ یو۔ پی حج کمیٹی کے قیام کی بڑے زور شور سے تائید کی سنی سنٹرل بورڈ کے قیام کے لئے حد بھر کوشش کی جب یہ بورڈ قایم ہوگیا تو مسلمانوں کی واقفیت کے لئے سب سے پہلے قانون اوقاف کو اردو میں ترجمہ کرکے شائع کیا۔ خود بھی اس بورڈ کے ممبر مقرر ہوگئے ان تمام مساعی جمیلہ ان کی کامیابیوں اور اپنے اثر و وقار

کے باوجود مرحوم کو نام و نمود یا جاہ طلبی کی طرف کبھی توجہ نہیں ہوئی حقیقت یہ ہے کہ جاہ و نمود کے حریص کوئی بھی قابل قدر قومی کام انجام نہیں دے سکتے۔ اس کا بیڑا تو دیوان گان محبت ہی اٹھاتے ہیں۔

پہلو ز دل پروانہ مگس را نہ دہند

قومی خدمات کے ساتھ ساتھ مرحوم کے ادبی خدمات بھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ انہوں نے اپنا پریس کھولا اور طباعت کا کام بہت اعلیٰ پیمانہ پر شروع کیا۔ نفیس کاغذ اور نفیس تر کتابت کا انتظام کیا۔ چند ہی دنوں میں نظامی پریس مشہور ہو گیا۔ اب انہیں مخصوص اور مفید نوعیت کی کتابیں چھاپنے کا خیال پیدا ہوا۔ غالب کا ایک خاص ایڈیشن نہایت عمدہ کاغذ اور دلفریب کتابت کے ساتھ شائع کیا۔ یہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے سات ایڈیشن مرحوم کی زندگی ہی میں شائع ہو گئے۔ ایک کتاب قاموس المشاہیر خود تالیف کر کے شائع کی۔ اس میں تمام مشاہیر کے مختلف حالات درج ہیں۔ یہ دو جلدوں میں ہے۔ اس کی اشاعت پر ملک میں دھوم مچ گئی۔ متعدد کتابیں بچوں کے لئے نہایت دلچسپ اور مفید خود تصنیف کر کے شائع کیں۔

مرحوم نے اپنے پریس اور اخبار ذوالقرنین سے بہترین کام لیا۔ ادھر کتابت و طباعت میں نفاست و خوش اسلوبی پیدا کی۔ اُدھر اُسے قومی خدمت کا ذریعہ بھی بنایا۔ غرض ان کی قومی لگن، حسن تدبیر اور صحیح الخیالی نے یکسر اُن کی زندگی کو قوم کی بے خدمت اور بیش بہا خدمت میں تبدیل کر دیا۔ اپنی قوم کا جو درد انہیں تھا ظاہر ہے لیکن یہ درد عام ملکی مفاد میں کبھی خلل انداز نہ ہو سکا۔ وہ ملک کی آزادی کے خواہاں تھے ہنماروؤں سے اتحاد و اشتراک عمل کے حامی تھے نفاق و افتراق کے نہیں۔ جس طرح قومی سود و بہبود کی کوششوں میں اپنی تحریر و تقریر میں جرأت اور بیباک رہے اسی طرح ہندو مسلم اتحاد کی حمایت اور علیحدگی کی مخالفت میں بھی کسی سے مرعوب نہ ہوئے مسلم لیگ اور تقسیم ملک کی ذہنیت کو ہمیشہ بُرا سمجھا اور برا کہا۔ مرحوم کی قومی زندگی تو ایک ممتاز پہلو رکھتی ہے۔

ان کی بعض دوسری خصوصیتیں بھی بہت نمایاں تھیں یعنی اُس ہندوستانی شائستگی اور تہذیب کا نمونہ تھیں جو ہندو مسلمانوں کے سالہا سال کے معاشرتی خلط ملط کا روشن پہلو ہیں۔ اس تہذیب کے خاص عنصر خوش اخلاقی، خلوص، وضعداری اور تواضع ہیں نئی روشنی کی سوسائٹی جھیلیں وقیانوسیت کا فتویٰ دیتی ہے۔ یہ وہ خصوصیتیں ہیں جن سے انسانیت عبارت ہے۔ جو اجتماعی زندگی کے حسن و جمال عظمت و وقار اور بقائے دوام کا راز ہیں۔ کہتے ہیں کہ تجارت اور اخلاق میں بیر ہے لیکن جہاں تک مجھے علم ہے انہوں نے اصول اخلاق کو کاروباری خوش معاملگی تک ہی ختم نہیں سمجھا بلکہ ہر پہلو سے نباہا ۱۹۲۶ء میں اپنی ایک سولہ صفحے کی نظم میں نے مرحوم کے مطبع میں چھپوائی جو شرائط طے ہوئے تھے ان سے کچھ بہتر ہی طریقے پر نظم طبع ہوئی۔ کتابت و طباعت اتنی نفیس کہ آجتک اُس کی چند کاپیاں نمونے کے طور پر میں نے محفوظ کر رکھی ہیں۔ یہ تو رہی خوش معاملگی۔ آگے حسن اخلاق کا پہلو نکلتا ہے۔ مرحوم نے جب مطبوعہ نظم کی جلدیں بھیجیں تو جہاں تک یاد ہے پچاس جلدیں اپنے یہاں اشاعت کے لئے رکھ لیں اور مجھے لکھا کہ جب آپ چھپائی کی اُجرت بھیجیں تو ان کی قیمت کم کر لیں میں نے بلا کمیشن کا لحاظ رکھے ہوئے اُجرت قیمت کاٹ کر رقم بھیج دی۔ مجھے ایسا نہ چاہیے تھا جس کی ذمہ داری کاروباری اصول سے میری بےخبری تھی۔ مرحوم نے رسید دیتے ہوئے جب مجھے خط لکھا تو اس کا ذکر تو ضرور کیا لیکن کسی کمیشن وغیرہ کا کبھی مطالبہ نہ کیا اسے حسن اخلاق نہ کہیں گے تو کیا کہیں گے۔

وہ بدایوں کی سرزمین میں پیدا ہوئے تھے۔ بدایوں کو میں مرحوم خیری میں دہلی اور لکھنؤ کے بعد دوسرا درجہ دیتا ہوں قدیم زمانے سے اب تک یہ شہر علم و فضل کا گہوارہ رہا ہے مُلا عبدالقادر نے جو شمع روشن کی تھی فانی بدایونی نے اُسے زندۂ جاوید کر دیا۔ آج بھی اچھے اچھے ادیب اور سخن گو یہاں موجود ہیں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر مرحوم سلامتی ذوق سے بہرہ مند تھے اور انھیں شعر گوئی کا شوق ہوا بڑی خوش قسمتی ہے کہ "لمعات نظامی" مجتمع و مرتب ہو کر آج ہمارے سامنے آ گئے ہیں

اس مجموعہ میں غزلیات کے علاوہ نعتیہ، قومی، سیاسی، اخلاقی، اصلاحی، سہرے، نوحے وغیرہ وغیرہ ہر رنگ کی نظمیں ہیں اور ہر صنف سخن میں ہیں۔ غزل میں محض قافیہ پیمائی نہیں اخلاقی نکات ہیں تغزل بھی ہے لیکن اعتدال لیے ہوئے۔ نظموں میں بیشتر حالی کا سا مصلحانہ رنگ ہے۔ میں نے جستہ جستہ اس مجموعے کو دیکھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی خلوص ہے یعنی شاعر نے وہی کہا ہے جو اس نے محسوس کیا ہے جس پر اس کا ایمان ہے جس پر اس کا عمل ہے۔ کلام میں استادانہ پختگی، صفائی اور روانی ہے۔ افسوس ہے کہ میری صحت اجازت نہیں دیتی کہ "لمعات نظامی" پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالوں ورنہ معنی و بیان دونوں حیثیت سے میں پیش کر دیتا۔ اصلیت یہ ہے کہ اس کی ضرورت بھی نہیں۔ دیکھنے والے دیکھیں گے کہ جس طرح اس کے مصنف سوسائٹی کا ایک زیور تھے اُن کی اس تصنیف میں بھی وہ خوبیاں ہیں جو فراست و فرزانگی کی دلیل ہیں اور حُب قومی کا سرمایہ۔ شاعری خود ہی ایک جمالیاتی خوبی ہے اور جب اس خوبی میں حسن خیال و عمل حسن خلوص و اخلاص اور شان وضعداری بھی شامل ہو جائے تو ایسی شخصیت ترکیب پاجاتی ہے جس کی مثالیں کم نظر آتی ہیں۔ حضرت نظامی مرحوم و مغفور ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے اُٹھ جانے سے جو جگہ خالی ہو گئی ہے پوری ہونا محال ہے۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں پاؤ گے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

شیام موہن لال جگر بریلوی

میرٹھ ۱۰ فروری ۱۹۵۵ء

مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی تاریخ وفات ۸ جون ۱۹۴۷ء

واقعاتِ حاضرہ
پر
غزلیں

لمعاتِ نظامی

واقعاتِ حاضرہ پر غزلیں

اکتوبر ۱۹۳۰ء

شومیٔ قسمت سے آبادی ہمیں ویرانہ ہے
خون دل پانی ہے رنج و غم ہمارا کھانا ہے

سبزۂ بیگانہ نے ڈھائی ہے ساری شہر پر
یہ ہمارا گھر ہے یا صحرا ہیں اک ویرانہ ہے

ہیں وطن میں بے وطن اُف رے ہماری بیکسی
یہ ہمارا غم کدہ غیروں کا عشرت خانہ ہے

علم و فن رخصت ہوئے صنعت ہماری چھن گئی
ہاں ہمیں [illegible]ش کرنے کو ملا میخانہ ہے

بھاگ گئی ہے ہم سے دولت کل جو تھی ہم پر فدا
آج اس کمبخت کا انداز معشوقانہ ہے

بینک بھی اپنے نہیں بازار بھی اپنے نہیں
کسب زر کا جو عمل ہے ہم سے وہ بیگانہ ہے

ظاہراً دیوانگی کو اہل دنیا کچھ کہیں
قوم کا دیوانہ لیکن عاقل و فرزانہ ہے

مٹ گئی ہے قوم لیکن دل ابھی مردہ نہیں
کچھ نہیں پلے مگر ہمت ابھی مردانہ ہے

ہے یہ اک نوحہ نظامی کے دل پر درد کا
ورنہ اس کو ادعائے شعر گوئی تھا نہ ہے

۷ر جنوری سنہ ۱۹۳۲ء

جفا سے راس آجائے تری تدبیر مشکل ہے
وفا سے راہ پر آئے مری تقدیر مشکل ہے

ستم سے زیر کر لینا بہت آسان ہے لیکن
جو دلداری سے ہو سکتی ہے وہ تسخیر مشکل ہے

نہ لکھنے کی اجازت ہے نہ دردِ دل سنانے کی
گھٹا جاتا ہے دم تحریر اور تقریر مشکل ہے

ادھر یہ بیقراری شاہد مقصد ابھی مل جائے
ادھر بے اعتنائی بے سبب تاخیر مشکل ہے

یہاں یہ شوق کا عالم وہاں عادت کی وہ دنیا
یہ حالت ہے تو جینا عاشق دلگیر مشکل ہے

جہاں دیکھو جدھر دیکھو خرابی کا ہے نظارہ
یہ ہے ہو تخریب کا عالم تو پھر تعمیر مشکل ہے

اسیر نالہ و فریاد سن اور غور کر اس پر
نہ ہوتا بہرہ حق جس وقت تک تاثیر مشکل ہے

۲۱ر فروری سنہ ۳۲ء

طور بے شک ہے وہ جلوہ تو سر طور نہیں
اس لئے ذوق طلب دید پہ مجبور نہیں

کبھی پوچھا ہے مرا حال کبھی دیکھا ہے
وہ جو کہتے ہیں مرا شیشۂ دل چور نہیں

تم یہ کیا جبر کہ وعدہ ابھی پورا کر دو
صبر کرنے کے لئے ہم بھی تو مجبور نہیں

کل جو ہم کہتے تھے وہ بات نہ مانی تم نے
آج جو کہتے ہو تم وہ ہمیں منظور نہیں

م جو دیتے ہو نوشتہ وہ نوشتہ کیا ہے
اس میں اک حرف وفا بھی کہیں مذکور نہیں

ے آئین نیا نظم نئی رسمیں ہیں
اب دنیا میں کہیں جبر کا دستور نہیں

ب کہا آپ امانت مری واپس دیدیں
آپ کی گوں کا یہ میرا دل رنجور نہیں

ہنس کے بولے کہ امانت ہی تھی یہ لیکن — واپسی کا تو مرے عہد میں دستور نہیں

شکر کر شکر نظامیؔ کہ زمانہ بدلا

تیری قسمت بھی بدل جائے تو کچھ دور نہیں

۲۹ مئی سنہ ۱۹۳۷ء

اگر وہ حسن خود آرا نمایاں ہو نہیں سکتا — تو رازِ عشق وحشت زا ابھی پنہاں ہو نہیں سکتا

جنونِ فتنہ ساماں وحشتِ دل جب سلامت ہے — تو کیا عشرت کدہ تیرا بیاباں ہو نہیں سکتا

مصیبت کا فسانہ میری پیشانی پہ لکھا ہے — بدبختی کا قصہ رازِ پنہاں ہو نہیں سکتا

اسے کیا لطفِ ہستی ہو نہ ہو جو رنج کا خوگر — مصیبت سے جو گھبرائے وہ انساں ہو نہیں سکتا

مسیحائی تمھاری بیٹھ رہی پیرو ندیم کی آخر — مرے دردِ نہاں کا تم سے درماں ہو نہیں سکتا

یہ پوچھا تھا مرا ارماں نہ ہوگا کیا کبھی پورا — تو جھنجلا کر وہ فرمانے لگے ہاں ہو نہیں سکتا

مرا دل جل کے خاکستر ہو قصہ پاک ہو جائے — ذرا سا کام تجھ سے آہِ سوزاں ہو نہیں سکتا

خدا کی شان ہے کہتے ہیں وہ مجھ سے خفا ہو کر — وفا دشمن سے ہرگز عہد و پیماں ہو نہیں سکتا

اگر سچ بولنا ہی جرم ہے حاضر ہے سر میرا — میں اپنی راست گوئی پر پشیماں ہو نہیں سکتا

اسی کا ہے وہ کشتہ ہم شہیدانہ نہیں جس کے — رقیب ہم سے کبھی دست و گریباں ہو نہیں سکتا

مزاج اب ہے کہ کریں ہم آہ و زاری بے خبر دل کر — وہ تنہا میرے نالوں سے پریشاں ہو نہیں سکتا

خود آرا خودنما خودکام خودبیں خودغرض خودسر — وفا پرور کبھی وہ آفتِ جاں ہو نہیں سکتا

سنا ہے ہمنشیں بجلی گری صیاد کے گھر پر — تو اب بھی میری آزادی کا ساماں ہو نہیں سکتا

ہوا میں اڑ کے جو ترچھی نظر کے تیر برسائے — یہ اڑنا رشکِ تختِ سلیماں ہو نہیں سکتا

روا داری و دلداری کا شیوہ عین مذہب ہے — کسی کا دل دکھانا جزوِ ایماں ہو نہیں سکتا

نظامی حضرتِ ناصح سے کیا اسلام کو نسبت
جو بندہ نفس کا ہو وہ مسلماں ہو نہیں سکتا

۱۹۳۹ء

دیکھ کے دل آپ ہی حیران و پریشاں ہونا — اپنے ہی ہاتھوں سے خود بے سر و ساماں ہونا

تیری تقسیم و ترقی کا بنا ہے باعث — میرے اجزائے عناصر کا پریشاں ہونا

آج اس گھر کے ہوئے مالک و مختار جناب — یاد ہے جس میں نہیں آپ کا مہماں ہونا

عیش دنیا کا میسر ہمیں کیوں کر ہوتا — جبکہ تقدیر میں لکھا تھا مسلماں ہونا

آدمیت کی ہوا بھی نہ لگے تم سے بھلا — تم نے سیکھا ہی نہیں خیر سے انساں ہونا

سجدے کر لیتے آئینے کے دو سو بار — ہوتا قسمت میں جو سنگِ درِ جاناں ہونا

آرزو مٹ کے ابھرتی تو سزا دیجاتی — تم نے دیکھا ہی نہیں مٹ کے نمایاں ہونا

نازکی جانِ حزیں میں نے تو ہنس کر بولا — چاہیے جبہ میری شان کے شایاں ہونا

پہلے بھٹکا دیا پھر آپ بلاتا ہے مجھے — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

قتل ایک ایک کو کر دو نہیں ڈر کس کا ہے — چاہتے ہو جو بھرے گھر کا بیاباں ہونا

ہے یہ اشعارِ نظامی کا فقط سرمایہ — کب میسر ہوا اسے صاحبِ دیواں ہونا

غلط بالکل غلط ہم اُن کو کب قائل سمجھتے ہیں
یہ اُن کا حُسنِ ظن ہے وہ ہمیں بسمل سمجھتے ہیں

ہمارے کہنے سُننے سے وہ کافر راہ پر آیا
ہم اپنی زندگانی کا اسے حاصل سمجھتے ہیں

کیا اغیار نے بدنام اُن کی بے وفا کہہ کر
وہ اس سازش میں ہم کو بھی شامل سمجھتے ہیں

اگر ہوں صلح پر راضی ابھی سب کام بنتا ہے
ذراسی بات ہے وہ اس کو کیوں مشکل سمجھتے ہیں

ابھی سب مرحلے طے ہوں بڑھائیں تو قدم اپنا
تعجب ہے کہ وہ اس کو کڑی منزل سمجھتے ہیں

مجھے دیدیں وہ اپنا دل تو اُن کو کچھ مزا آئے
یہ فقرہ ہے کہ میرا دل وہ اپنا دل سمجھتے ہیں

جدھر دیکھو اُدھر غماز اور غدار ہیں ہمیں
تمہاری بزم ہم اشرار کی محفل سمجھتے ہیں

وہ کہتے ہیں کہ ہم پامال کرکے اسکو چھوڑیں گے
غنیمت ہے کہ میرے دل کو اس قابل سمجھتے ہیں

نظامی دور ہی سے عرض کرتا ہے سلام ان کو
خدا جانے اُسے اپنا وہ کیوں مائل سمجھتے ہیں

سنہ ۱۹۴۰ء

کیا ڈر ہے آپ شوق سے مجنوں بنا کریں
جنگل بسائیں چاک گریباں کیا کریں

جس طرح چاہیں روز زمانے کو دیں فریب
لیکن کبھی نہ نام محبت لیا کریں

ہاں مختصر نہیں ہے مری داستانِ غم
خاموش آپ صبر سے بیٹھے سنا کریں

دشمن کی کامرانی کا افسانہ ہے عجیب
وہ بھول کر سُنائیں ہمیں ہم سنا کریں

اے کاش وہ ہمارا دل زار پھیر دیں
سو بار اُن سے عرض کریں التجا کریں

ہمت بھی پست ہوگئی دل بھی نہیں رہا
ہم سے نہ آپ کچھ نہیں ہم بر دبا کریں

سچ پوچھیے تو اپنے ہی ہاتھوں ہوئے تباہ — ہم روئیں کس کی جان کو کس کا گلا کریں

دل بھر گیا ہے بیٹھے ہیں مُنہ لیے ہوئے — وہ مانگتے ہیں اس کو بتاؤ تو کیا کریں

وہ روزِ بد کسی کو نہ ہو دیکھنا نصیب — جب آپ کے اسیر قیامت بپا کریں

ٹوٹا قفس تو ہوگا مصیبت کا سامنا — بہتر یہ ہے کہ آپ ہی اُن کو رہا کریں

جھگڑا بڑا نہیں ہے بس اتنی سی بات ہے — وہ مانتے نہیں ہماری ہم اُن کا کہا کریں

پروا ہے برہمن کی اُسے اور نہ شیخ کی — پھر کیوں سوال مذہب بات کھڑا کریں

میرا کلام سُن کے مجھے داد دی تو یہ — پردے سے باہر آئیں ذرا سامنا کریں

نکتہ چینوں کا طرز تو ہم کو نہیں پسند (ق) — گر دشمنی بھی کرتے ہیں تو برملا کریں

اُن کو تلاش ہے کہ لطافیؔ کدھر گیا — مل جائے وہ تو اُس کو اسیرِ بلا کریں

کہہ دے یہ اُن سے کوئی ... وہ جی سے گزر گیا
آپ اُس کی مغفرت کیلئے اب دُعا کریں

سنہ ۱۹۴۰ء

مجھے قُرب گر اُس کا حاصل نہیں ہے — یہ مشکل کوئی ایسی مشکل نہیں ہے

جُدا بھی نہیں ہے جُدا بھی ہے مجھ سے — وہ واصل بھی ہے اور واصل نہیں ہے

ہے انصاف کی اُس سے اُمید بے جا — وہ مُنصف نہیں ہے وہ عادل نہیں ہے

مرے دل کو ٹھکرا کے غصّے سے بولے — ”نگاہِ محبت کے قابل نہیں ہے“

سراسر غلط ہے یہ الزام اُس پر — وہ دانا نہیں ہے وہ عاقل نہیں ہے
وہ ہر فن میں ہو طاق عیار ہو وہ — وہ ناداں نہیں ہو وہ جاہل نہیں ہے
اُسے لطف آتا ہے مشقِ جفا میں — ستم سے کسی وقت غافل نہیں ہے
جہاں ہم سے آزاد بھی وقت کاٹیں — یہ محفل تمہاری وہ محفل نہیں ہے
تھکے ماندوں کی ہو جو آرام منزل — یہ منزل تمہاری وہ منزل نہیں ہے
تڑپے گی مری کشتی کیسے ترے گی — یہ وہ بحر ہے جس کا ساحل نہیں ہے

مساوات کا مدعی ہے نظامی
گدا اگر نہیں ہے وہ سائل نہیں ہے

سنہ ۱۹۴۰ء

یار کے گھر بلائے جاتے ہیں — آج روٹھے منائے جاتے ہیں
پوچھتے کیا ہو اُن کے ناز و نیاز — سارے جھگڑے چکائے جاتے ہیں
اپنے جامہ سے کیوں نہ ہوں باہر — طوقِ زریں پنہائے جاتے ہیں
رات کچھ خواب میں پڑا پایا — صبح سے مسکرائے جاتے ہیں
کچھ تو ہے بات آج گھی کے چراغ — شام ہی سے جلائے جاتے ہیں
کھانے پیتوں کو سرفراز کیا — کیا یہ بھوکے کھلائے جاتے ہیں
کیا پلٹتی ہیں قسمتیں یوں ہی — یوں ہی بگڑے بنائے جاتے ہیں
دور ہے میری منزل مقصود — پاؤں کیوں ڈگمگائے جاتے ہیں

منہ چڑھے تھے کسی کے جو کل تک
دار پر وہ چڑھائے جاتے ہیں
کل جو امید کے جلے تھے چراغ
آج وہ جھلملائے جاتے ہیں
غیر کی کیوں نہیں خبر لیتے
کیوں مجھی کو سنائے جاتے ہیں
میں کہوں تو زبان کٹتی ہے
اپنا دکھڑا سنائے جاتے ہیں
حکم ہے یہ کہ کوئی اُف نہ کرے
قفل منہ پر لگائے جاتے ہیں
اُن کو یہ ڈر ہے میں دغا نہ کروں
مجھ پہ پہرے بٹھائے جاتے ہیں
جان پر میری بن گئی ہے یہاں
آپ اپنی لگائے جاتے ہیں
تھا جہاں اتحاد کا منظر
اب وہاں سر کٹائے جاتے ہیں
جہاں بہتے تھے امن کے دریا
اب وہاں خوں بہائے جاتے ہیں
جلد دُنیا پلٹنے والی ہے
ایسے آثار پائے جاتے ہیں
واہ رے رعبِ حُسن کیا کہنا
سارے عالم پہ چھائے جاتے ہیں
کوئی دیکھے نہ ان کو بے پردہ
میرے دل میں سمائے جاتے ہیں
چڑھ گئی جھینپ سب حسینوں کو
آپ سے وہ لجائے جاتے ہیں
سُن کے اُس کی کھری کھری باتیں
وہ نظامی کو کھائے جاتے ہیں

سنہ ۱۹۴۰ء

کیا عجب ہے کہ ہو سرمایہ کو محنت سے شکست
فتح مزدور کی ہو جائے یہ کچھ دور نہیں

ظلم سے اک ستم ایجاد کے رنجور ہیں آپ
آپ کے عدل سے بھی تو کوئی مسرور نہیں

باتوں ہی سے جو ہمیں ملتے ہیں ہم مرتبہ ہیں
جان لیں آپ کہ دنیا کا یہ دستور نہیں

جو وفادار ازل سے ہیں نہ ہو ان پہ کرم
یہ ستمگر کی ادا تو ہمیں منظور نہیں

جب دیا رنج بتوں نے تو ہمیں یاد کیا
جانتے کاش کہ ہم سا کوئی مجبور نہیں

جھوٹ کے مرتے ہیں نہیں ضعف سے ہلنے کی سکت
ہم میں طاقت نہیں جرات نہیں مقدور نہیں

سب یہ اوصاف ہیں آپ کے ہو دل یہ نثار
اب اندھیرے میں بھٹکتے ہیں کہیں نور نہیں

دکھ کے پہونچانے کی طاقت تو ہوئی ہے مفقود
ظلم سہنے میں مگر ہم کبھی معذور نہیں

سنہ ۱۹۴۰ء

آنکھ میں کون سمایا ہے بتاتے بھی نہیں
دل میں کیا چوٹ لگی ہے وہ دکھاتے بھی نہیں

نوحۂ غم بھی نہیں نغمۂ شادی ہے کہاں
مجھ پہ روتے بھی نہیں مجھ کو ہنساتے بھی نہیں

مارتے ہیں مجھے رہ رہ کے یہ انداز ہے کیا
وہ ستاتے بھی ہیں جی بھر کے ستاتے بھی نہیں

ستم ایجادوں سے پوچھے کوئی انداز جفا
وہ مٹاتے بھی ہیں اور دل کو مٹاتے بھی نہیں

کان بھی بند ہیں اور مہر لگی ہے لب پر
میری سنتے بھی نہیں اپنی سناتے بھی نہیں

نعش کو دیکھ کے وہ رہ گئے خاموش کھڑے
آپ روتے بھی نہیں اور رلاتے بھی نہیں

وہ شب وصل میں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
نیند میں بھی ہیں مگر نیند کے ماتے بھی نہیں

دل کے دینے میں نہیں عذر لطافت کو مگر
یہ وہ شے ہے کہ جسے مفت لٹاتے بھی نہیں

جولائی سنہ ۱۹۴۰ء

گل پہ تو گل کھلائے جا تازہ بہ تازہ نو بہ نو
باغ ہرے دکھائے جا تازہ بہ تازہ نو بہ نو

وعدہ کا تیرے اعتبار کس کو ہے اے ستم شعار
باتیں یونہی بنائے جا تازہ بہ تازہ نو بہ نو

لے نہ وفا کا نام تو تجھ کو وفا سے کام کیا
وعدوں کے رنگ لائے جا تازہ بہ تازہ نو بہ نو

زلف کا پیچ و خم رہے تجھ کو دلوں کی کیا کمی
جال یونہی بچھائے جا تازہ بہ تازہ نو بہ نو

حسن کے ملک میں اگر لطف و کرم کا قحط ہے
مجھ پہ ستم تو ڈھائے جا تازہ بہ تازہ نو بہ نو

تیری بلا وفا کرے تجھ کو وفا سے کیا غرض
ظلم پہ ظلم ڈھائے جا تازہ بہ تازہ نو بہ نو

اے دلِ رنج آشنا شکوہ سے فائدہ ہی کیا
زخم پہ زخم کھائے جا تازہ بہ تازہ نو بہ نو

دل کی لگی کبھی بجھے اس کی نہ رکھ امید کچھ
اشک یونہی بہائے جا تازہ بہ تازہ نو بہ نو

نام نہ لے نظامی کا نام سے ہوں گے وہ خفا
شعر انھیں سنائے جا تازہ بہ تازہ نو بہ نو

۱۳ ر جولائی سنہ ۱۹۴۰ء

ادائیں نئی ہیں تیری بانکپن میں
نہ کچھ فرق آجائے رسمِ کہن میں

نہ پوچھو قفس میں گذرتی ہے کیونکر
نگاہیں بیاباں میں دل ہے چمن میں

ہم آزاد ہوں گے ہم آزاد ہوں گے
قفس سے یہ آتی صدا ہے چمن میں

وہ صیاد خود پیچ میں آگیا ہے
چمن سے خبر آئی ہے یہ وطن میں

کئے جا کئے جا ستم ہی کئے جا
مزہ ہے کڑھن میں مزہ ہے مرن میں

سمجھ لیں یہ سب ہوں ہیں کشتہ تمھارا — لگا دو کوئی شاخ ایسی کفن میں

کہاں تک ہے تاکید ضبطِ فغاں کی — لگایا ہے کیوں قفل میرے دہن میں

تمھیں نے بتائیں تمھیں نے سکھائیں — غلامی کی رسمیں رہن میں سہن میں

مرے دل کی دنیا ہی بدلی ہوئی ہے — تڑپ میں سکوں اور ٹھنڈک جلن میں

کوئی ہم سے پوچھے ہے کتنی صداقت — تمھاری قسم میں تمھارے بچن میں

وفا کا سلیقہ جفا کا طریقہ — ہمارے چلن میں تمھارے چلن میں

محبت کا انجام شاید یہی ہے — کہ شعلے سے اٹھنے لگے تن بدن میں

برائی جو دیں دخل ان کو غرض کیا — غرض کی ہو جب جنگ دو ڈھاہن میں

نظامی کرو ان سے کیوں عرضِ مطلب
اثر ہی نہیں جب تمھارے سخن میں

۲۱ اگست ۱۹۴۰ء

ستم ہوں کیوں نہ بار بار عجب عجب نئے نئے — پھنسے ہیں آج دلفگار عجب عجب نئے نئے

اسیر ان کی زلف کے قتیل ان کی آنکھ کے — کہ ہو رہے ہیں یہ شکار عجب عجب نئے نئے

سکھائے کس نے ناز و گھات اسے جفا کے سلسلے — کہ جس پہ ہو رہے ہیں وار عجب عجب نئے نئے

ہنسی اڑا رہیں درد کی نہ لاج دل نہ کچھ کریں — یہ دوست ہیں یہ غمگسار عجب عجب نئے نئے

نہ خم یہ ان کا ہاتھ ہے نہ جام ان کے ہاتھ میں — ہوگئے ہیں مست بادہ خوار عجب عجب نئے نئے

نہ اب وہ رسم و راہ ہے نہ مجھ سے اب نباہ ہے — بدل گئے ہیں سب شعار عجب عجب نئے نئے

نہ وہ قرارِ صلح کے نہ جنگ کے وہ قاعدے ہیں اب اصولِ کارزار عجیب عجیب نئے نئے
تراشتا ہی تہمتیں نہیں ہے باک جھوٹ میں کھلائے اس نے گل ہزار عجیب عجیب نئے نئے
نہ ملک وہ نہ شہر وہ بدل گئی ہیں صورتیں ہوئے ہیں رونما دیار عجیب عجیب نئے نئے

نظامی یہ غزل نہیں ہیں نقش واقعات کے
ہیں کیسے خوشنما نگار عجیب عجیب نئے نئے

۸ ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء

سمجھتے ہیں کہ وہ بدعہد اپنا ہو نہیں سکتا مگر ہم سے کبھی ترکِ تمنا ہو نہیں سکتا
رقیبِ روسیہ سے آج بڑھ صحبت اُن سے بگڑی ہے چلو دیکھ آئیں پھر ایسا تماشا ہو نہیں سکتا
مرے اصرارِ وعدہ سے پریشاں ہو کے کہتے ہیں پریشانی کے عالم میں تو وعدہ ہو نہیں سکتا
سمجھ کر اُس کو بدخواہ و جفا جو دل دیا ہم نے ستمگر کے ستم کا کوئی شکوہ ہو نہیں سکتا
بھروسہ جو نہ رکھے ہم پہ ہم کو غیر گردانے ہم اُس کو لاکھ اپنائیں وہ اپنا ہو نہیں سکتا
مثل مشہور ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے بندہ نہ ہو دینا تو لینے کا تقاضا ہو نہیں سکتا
جگر میں درد ہے تبرید کا تجویز کیجئے نسخہ دوائے گرم سے اس کا مداوا ہو نہیں سکتا
میں آخر آدمی ہوں مجھ کو ہے احساسِ خودداری وہ ٹھکرا دیں مجھے ذلت سہوں ایسا ہو نہیں سکتا
سُنا ہے آج قاصد آخری پیغام لایا ہے وہ کہتے ہیں تمہارا عزم پورا ہو نہیں سکتا
کریں گے کام وہ جو شانِ جبروتی کو زیبا ہے کسی طاقت سے ہم جھک جائیں ایسا ہو نہیں سکتا
زمانہ کہتا ہے اک دم میں ہو جاتا ہے کیا سے کیا کہا کیا تم نے پھر کہنا کہ ایسا ہو نہیں سکتا

خدا جانے کہ کل تک حادثہ کس کس پہ ہو بیٹھے
یہ کہنا آج قسمت کا لکھا ہو ہی نہیں سکتا

دردمندوں کو اس پیغام پر خندہ مسرت ہے
وہ کہتے ہیں کہ اس سے بڑھ کے مژدہ ہو نہیں سکتا

نظامی نے جو شعر اپنے پیش کیں عہد محبت میں
خفا ہو کر وہ بولے تم سے سودا ہو نہیں سکتا

اکتوبر ۱۹۴۰ء

آپ نے مشقِ جفا مجھ کو بنا رکھا ہے
پھر رواداری کا کیوں شور مچا رکھا ہے

مرضِ عشق کا سمجھا ہے اسی کو وہ علاج
درد کا نام ستمگر نے دوا رکھا ہے

راز کھل جائے کسی پر تو خفا ہوتے ہیں
میں نے سینہ میں دلِ کشتہ چھپا رکھا ہے

کیوں نہ کہیے اُس کو جفاکار و ستمگر کوئی
نام کہنے کیلئے اُس نے وفا رکھا ہے

کیوں وفاداری کے فتنے میں پڑ جانے مجھکو
کیوں اُنہوں نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے

میرے پھندے میں پھنسے گا وہ نہ ہوگا آزاد
حکمِ صیاد نے پہلے سے لگا رکھا ہے

وہ مجھے دیتے ہیں آزار رہ رہ کے ناحق
کوئی پوچھے تو کہ کیا ان میں مزا رکھا ہے

ہم گنہگار نہیں دیں جو کوئی نیک صلاح
نام نیکی کا شرارت سے خطا رکھا ہے

ہاتھ بھر کی تو زباں پر نہ ہے غصہ اُس کو
اُس کی تصویر کو سینہ سے لگا رکھا ہے

کھینچ دیتا ہے زمانہ کی نظامی تصویر
اُس کے اشعار میں کیا اس کے سوا رکھا ہے

اکتوبر ۱۹۴۰ء

ترے ناز کی چوٹ کھائے ہوئے ہیں　　ستائے ہوئے ہیں ستائے ہوئے ہیں

نگاہوں سے جو تیر چھوڑے ہیں تم نے　　مرے دل کے اندر سمائے ہوئے ہیں

ہیں یاد ستم، دردِ دل، فکرِ فردا　　یہ مہمان اُن کے بلائے ہوئے ہیں

عبث یاد اُن کو جفائیں دلائیں　　وہ جھینپے ہوئے ہیں لجائے ہوئے ہیں

نئی بات ہو کچھ اگر تو سُنیں وہ　　یہ قصے پرانے سنائے ہوئے ہیں

زباں سے اگر کچھ کہوں تو غضب ہے　　مرے منہ پہ مہریں بٹھائے ہوئے ہیں

غلط ہے کہ وہ قول پورا کریں گے　　وہ دیکھے ہوئے آزمائے ہوئے ہیں

وہ ہنستے ہیں کیوں میرے زخمِ جگر پر　　انھیں کے تو یہ گل کھلائے ہوئے ہیں

اگر دل میں ہو کھوٹ اللہ جانے　　وہ ظاہر تو اپنا بنائے ہوئے ہیں

ب ہی تو ہوئی اُن کی ایسی ہی حالت　　کسی سے وہ دل کو لگائے ہوئے ہیں

نظامی ملے جا کے غیروں سے کیوں تم
کبھی تھے جو اپنے پرائے ہوئے ہیں

دسمبر ۱۹۴۱ء

یکدہ نہ کوئی مے گسار باقی ہے　　نہ بادہ ہے نہ کوئی بادہ خوار باقی ہے

ں انقلاب پہ آنسو بہانے والوں میں　　فقط ہمارا دلِ سوگوار باقی ہے

وہ دل نہیں وہ اسکو تم کہتے ہیں فضول　　نہ اس میں بوئے محبت نہ پیار باقی ہے

ہوا زمانہ پرندہ اُڑ گیا کہیں کا کہیں
غلط خیال ہے اُن کا شکار باقی ہے

گیا ہے سانپ نکل وہ لکیر پیٹیں گے
اسی لکیر پہ اب اختیار باقی ہے

وہ ہم کو غیر سمجھتے ہیں اس کا کیا شکوہ
ہمیں بھی اُن کا کہیں اعتبار باقی ہے

خزاں میں دل کی کلی گر نہیں کھلی تو کیا
ابھی تو آمدِ فصلِ بہار باقی ہے

جو وعدے اُس نے کئے تھے وہ ہو گئے غائب
فضا میں اُن کا مگر کچھ غبار باقی ہے

وہ کہتے ہیں کہ نظامی کو کس طرح بھولیں
ابھی تو اس کا نشانِ مزار باقی ہے

۲۴ فروری ۱۹۴۱ء

بریلی میں ۲۴ فروری ۱۹۴۱ء کی رات کو پراونشل مسلم تعلیمی کانفرنس کا اجلاس ختم ہونے کے بعد اُسی کے پنڈال میں ایک بزمِ سخن بھی منعقد ہوئی تھی یہ اُس کی طرحی غزل ہے۔

تمہیں سے پوچھتا ہوں وہ بھی انساں کوئی انساں ہے
نہ وعدہ جس کا وعدہ ہے نہ پیماں جس کا پیماں ہے

نمائش گاہِ قہر و جور یہ ناحق بزمِ جاناں ہے
کفن لیکر بڑھو سوئے عدو مرنے کا ساماں ہے

کسی کا صبر لینا دورِ بربادی کا عنواں ہے
خبر ہے کچھ تمہارے جبر سے دنیا پریشاں ہے

نرالی جنگ ہے درپیش دیکھیں کیا نتیجہ ہو
مرا مجروح دل ہے اور اُن کا تیر پیکاں ہے

اسیروں کی دلِ آزاری میں یہ دلچسپیاں کیسی
ارے ہمدم نہیں اُٹھیں کہ یہ تو آباد زنداں ہے

ستم سے اُس کے خوش ہیں ورنہ جفا پر اُس کی ہم راضی
خطاؤں پر وہ اپنی کس لئے سر در گریباں ہے

عدو نے وہ دبی چٹکی کہ آنکھیں رہ گئیں کھل کر
سنا جاتا ہے اب وہ ظلم پر اپنے پشیماں ہے

محبت میں وفاداری کی ہم نے انتہا کر دی — مگر جور و جفا اب بھی کسی کا دین و ایمان ہے

وہ میرا خوں بہا لے جاتے ہیں یہ کہتے جاتے ہیں — یہی تیرا مداوا ہے اسی میں تیرا درماں ہے

اسیرانِ قفس تو خیریت سے ہیں خدا رکھے — کوئی پوچھے کہ پھر صیاد کیوں ناحق پریشاں ہے

نظامی جذبۂ حُبِّ وطن کا تیرے کیا کہنا
اسی سے دل منور ہے یہی تو نورِ ایمان ہے

۵ اپریل ۱۹۴۱ء

بادہ و ساغر بھی ہیں اور ساقی و میخانہ ہم — شمعِ محفل بھی ہیں اور ہیں شمع کے پروانہ ہم

ہمتِ فرہاد بھی فرمائشِ شیریں بھی ہیں — عشق کی منزل بھی ہیں اور محفلِ جانانہ ہم

اب نہ وہ صحرا نوردی ہے نہ وہ سیرِ چمن — رہ گئے ہیں اب تو بن کر زینتِ کاشانہ ہم

اپنے دیوانوں کے حال سے نہیں وہ آشنا — اُن کو دکھلائیں گے جا کر جنبشِ مستانہ ہم

فصلِ گل ہی ہے دیکھئے کیا رنگ لاتا ہے جنوں — خود غرض خود کام وہ ہیں اور ہیں دیوانہ ہم

دل کے گوشہ ہی میں شاید مقصد ملے — کر چکے برسوں طوافِ کعبہ و بتخانہ ہم

یہ زمانہ کی نظامی سحر کاری دیکھئے
یعنی اب اپنے یگانوں سے بھی ہیں بیگانہ ہم

جون ۱۹۴۱ء

رات دن گردش میں ہیں وجہِ ظفر یہ تھا تو ہے — مارے مارے پھرتے ہیں لطفِ حضر یہ بھی تو ہے

میکشی میں رات بھر اپنی گذرتی ہے اگر — توبہ سے غافل ہیں کب وقتِ سحر یہ بھی تو ہے

اُن کی صورت دیکھ کے چہرہ پہ آجاتی ہے آب
رنجِ فرقت کو چھپانا اک ہنر یہ بھی تو ہے

اُن سے جب ملتے ہیں وہ کرتے ہیں گوئی مری
منظرِ اغیار کا شام و سحر یہ بھی تو ہے

خود فراموشی تھی پہلے اب نہیں اللہ یاد
ان بتوں سے دل لگانے کا ثمر یہ بھی تو ہے

ہم نے پایا محبت سے ہے لطفِ زندگی
اس کا آخر تک نبھانا اک ہنر یہ بھی تو ہے

وہ سمجھتے ہیں کہ گھائل کر کے چھٹی ہو گئی
رنگ لائیں گے مرے زخمِ جگر یہ بھی تو ہے

جانتے ہیں وہ زمانہ آج اُن کے ساتھ ہے
دوسری کروٹ بدلے گا اک خبر یہ بھی تو ہے

جو یہ کہتے ہیں زمانہ منقلب ہوتا نہیں
ہوتے رہتے ہیں وہی زیر و زبر یہ بھی تو ہے

کرتے ہیں تعمیر دنیا میں جو عالیشان گھر
باندھ لیتے ہیں وہی رختِ سفر یہ بھی تو ہے

میں اگر بے خانماں ہوں وہ مرے دل میں ہیں
اُن کے رہنے کیلئے چھوٹا سا گھر یہ بھی تو ہے

سامنے میرے نہ آئیں مجھ سے پردہ ہی کریں
وہ مرے دل میں رہیں پیشِ نظر یہ بھی تو ہے

دل سے دل کو راہ ہے پھر کیوں تو وہ چاہیں مجھے
غیر کی باتوں میں آجائیں گے ڈر یہ بھی تو ہے

یاد میں خالق کی رہتا ہے ہمیشہ وہ مگن
بھول جاتا ہے کبھی بندہ بشر یہ بھی تو ہے

تم یہ کہتے ہو نظامی کے ہیں سب اشعار پست
دل ہلا دیتے ہیں وہ اُن کا اثر یہ بھی تو ہے

۱۱ ستمبر ۱۹۴۱ء

بدلی ہے راہ و رسمِ دیارِ وفا کچھ اور
کرنی ہے اُس سے آج مجھے التجا کچھ اور

کوچہ میں آج اُس کے قیامت بپا ہوئی
صیاد خود بلا میں ہے تم نے سنا کچھ اور

ترچھی نگاہ جب مجھے بسمل نہ کر سکی — کہتا ہے وہ نکالیں گے طرزِ جفا کچھ اور
صیاد تجھ کو فکرِ قفس کی فضول ہے — مژدہ ہمیں سناتی ہے بادِ صبا کچھ اور
وعدے جو کل کئے تھے فراموش ہو گئے — کہتے ہیں آج ہم سے یہ اہلِ جفا کچھ اور
کچھ قول و فعل میں نہیں اس کے مطابقت — کہنے کی بات اور تھی اس نے کیا کچھ اور
اُس شوخ نے مزاج ہی اپنا بدل دیا — پہلے وہ مہربان تھا اب ہو گیا کچھ اور
دل کو مرے مسل کے وہ رکھتا ہے اپنے ہاتھ — سرخی کچھ اس کی اور ہے رنگِ حنا کچھ اور
مت کٹ گئی طبیب کی کیا غضب ہوا — میرا مرض ہے اور مگر ہے دوا کچھ اور
کب حسن و عشق میری غزل کا ہے ماحصل — ہے شعر و شاعری سے مرا مدعا کچھ اور

قائل ہیں اب نظامی کی صدق و صفا کے سب
بدنام پہلے کرتے تھے اہلِ صفا کچھ اور

۲۸ اکتوبر ۱۹۴۱ء

منزلِ عشق اک عذاب بھی ہے — اُس سے ملتی وہ ثواب بھی ہے
عزمِ راسخ کے ساتھ بے چینی — صبر کے ساتھ اضطراب بھی ہے
عید کا دن ہے ہاں پلا ساقی — اس گناہ میں چھپا ثواب بھی ہے
اسی عالم میں اُن کو دیکھا ہے — جاگتا بھی ہوں لطفِ خواب بھی ہے
آنکھیں نیچی ہیں شرم ہے دل میں — رخ سے اُلٹا ہوا نقاب بھی ہے
پیاری پیاری ہے تضاد کی صورت — بے تکلف بھی ہیں حجاب بھی ہے

صاف صاف اس شانِ دلربائی کے | اس ادا کا کہیں جواب بھی ہے
دِل کا کیا ہو بقول غالب کے | گر نگہ رُخ سے کامیاب بھی ہے
عیش و عشرت کے شغل ہیں اُن کے | چنگ بھی ساز بھی رباب بھی ہے
جب جفاؤں کی ہو چکی بھرمار | میں نے پوچھا کوئی حساب بھی ہے
لفظ قانون کی ہے مٹی خوار | مُستند عدل کی کتاب بھی ہے
جسم گرزار ہے تو دِل ہے جواں | عہد پیری کا ہے شباب بھی ہے
اک وفادار کی ہے اُن کو تلاش | سُنتے ہیں آج انتخاب بھی ہے
خود غرض میرا نام رکھا ہے | اس سے بڑھ کر کوئی خطاب بھی ہے
لُطف کا لطف پھر نہیں رہتا | ساتھ میں اُس کے گر عتاب بھی ہے

بولے سُن کر غزل نظامی کی
کوئی شعر اس میں کامیاب بھی ہے

۲۳ نومبر ۱۹۴۱ء

برگشتہ کبھی ایسا مقدر نہ ہوا تھا | گردش نہ تھی ایسا بھی چکر نہ ہوا تھا
جس سمت نظر کیجئے ہے یاس کا عالم | ایسا تو کبھی سامنے منظر نہ ہوا تھا
جس طرح مصیبت کا پہاڑ آج گرا ہے | پہلے کبھی غم بال برابر نہ ہوا تھا
سُنتے ہیں کہ اُس شوخ نے بدلی ہیں نگاہیں | اچھا ہوا ہیں لطف کا خوگر نہ ہوا تھا
منزل ہے ابھی دور بھٹکنے لگے رہ رو | گمراہ کبھی ایسا تو رہبر نہ ہوا تھا

کیوں آج وہ ہیں اپنی جفاؤں پہ پشیماں
شرمندہ کبھی ایسا ستمگر نہ ہوا تھا

کیا جانئے کیوں آج عنایت کی نظر ہے
اُن کا یہ کرم تو کبھی مجھ پر نہ ہوا تھا

کیوں آج نظامیؔ کو کیا یاد ہے اُس نے
نالہ تو کبھی اس کا سو ثر نہ ہوا تھا

۲۸ نومبر ۱۹۴۹ء

عشق کیا چیز ہے بس بندۂ جاناں ہونا
خود گواں بیٹھا دل آپ ہی حیراں ہونا

منزلِ عشق میں آپے سے گذر جاتا ہوں
یاد رہتا ہی نہیں ہے مجھے انساں ہونا

تختۂ مشق ستم پہلے بنانا مجھکو
خود ہی پھر اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہونا

جب سُنی غیر کے آنے کی خبر ہوش اُڑے
تھا غضب اُس کا وہ انگشت بہ دنداں ہونا

نہ رہیگا یہ ستم اب نہ ستمگر باقی
چند روزہ یہ ہوا ہے تہ پریشاں ہونا

اُس کے دشمن نے بھرے گھر کو کیا جب برباد
یاد آیا ہے مرا بے سر و ساماں ہونا

طنز سے مجھ کو وہ آوارہ وطن کہتا تھا
اُس نے خود دیکھ لیا گھر کا بیاباں ہونا

خانہ بربادی سے میری جسے رونق تھی ملی
اک تماشا ہے اس آبادی کا ویراں ہونا

اپنے سینے میں تو تجلی کی چمک پیدا کر
یوں تو آسان ہے داغوں سے چراغاں ہونا

چارہ گر سے کوئی کہہ دے کہ نہ کر فکر علاج
ہم کو منظور رہا اب تشنۂ درماں ہونا

بات بننے کیلئے غیر سے مانگوں میں مدد
بات غیرت کی ہے شرمندۂ احساں ہونا

غیر نے اُس کو جھکوے تو دیئے ہیں کچھ کچھ
ابھی باقی ہے مگر موت کا ساماں ہونا

سُن کے اشعار نظامیؔ کے وہ ہنس کر بولے
نہیں آسان ہے اُردو میں سخن داں ہونا

۲۷ نومبر ۱۹۴۱ء

مرے گھر وہ سچ مچ جو آئیں تو کیا ہو
قیامت ہی آجائے محشر بپا ہو

نگاہوں کے وہ تیر برسا رہے ہیں
یہ ممکن نہیں ہے نشانہ خطا ہو

مصیبت پڑی ہے تو چلا رہے ہیں
تمہارا بھلا ہو، بھلا ہو بھلا ہو

زمانہ جو بدلا تو کہتے ہیں مجھ سے
جو ہم چاہتے ہیں وہی تم بھی چاہو

مجھے جان کے اپنی لالے پڑے ہیں
تمہیں یہ پڑی ہے کہ وعدہ وفا ہو

ستم پر ستم ہے مگر اُف نہیں ہے
کلیجہ کو مجھ سنگدل کے سراہو

نہ وہ جوش ہے اور نہ وہ ولولے ہیں
کروں کیا جو کمبخت دل چھن گیا ہو

تمھیں نے تو دل لے کے بدلا گیا ہے
بتاؤ اگر اس میں میری خطا ہو

نہ دو بیٹھتے اُٹھتے ذلت کے طعنے
قسم لو جو اس کے سوا مدعا ہو

دکھانے کو میں غیر کے ہوں کشیدہ
جو دشمن تمھارا ہو اُس کا بُرا ہو

تمہارے کرم کا جو مارا ہوا ہے
نظامیؔ ہے وہ نام شاید سنا ہو

۲۸ نومبر ۱۹۴۱ء

باقی تو ہوں میں، نام کو تو نام رہ گیا
رہ تو گیا اگرچہ میں ناکام رہ گیا

صیاد کی گرفت نے تڑپا دیا مجھے
بس ہو کے مضطرب میں تہ دام رہ گیا

شکوہ ہے مجھ سے وعدہ پہ اُن کے بنا نہ صبر
یہ عمر بھر کے واسطے الزام رہ گیا

دوڑے پیامبر نہ بنا کچھ معاملہ
آغاز تو ہوا مگر انجام رہ گیا

دل ٹوٹ کر رقیب سی کمبخت جا مِلا
کل رات بنتے بنتے مرا کام رہ گیا

اس ضعف کا بُرا ہو کہ پہونچا نہیں وہاں
تنہا پڑا ہوا وہ سرِ بام رہ گیا

تعریف جس کی کرتے تھے اغیار سی کبھی
وہ بدنصیب قابل دشنام رہ گیا

دولت نہیں ہنر نہیں عزت نہیں رہی
میں خالی ہاتھ بندۂ بے درم رہ گیا

جو دل کبھی تھا عیش و مسرت کی جلوہ گاہ
وہ آج بن کے موردِ آلام رہ گیا

مینا بچا اور نہ مے نہ وہ پہلے سے مے گسار
باقی میں مثل دُردِ تہِ جام رہ گیا

احسن گئے، قمر گئے، فانی بھی چل دیے
زندہ فقط نظامی گم نام رہ گیا

۵ ر دسمبر ۱۹۴۱ء

ذرا خاموش آہوں کا اثر بھی دیکھتے جاؤ
مرے نخل تمنا میں ثمر بھی دیکھتے جاؤ

مرے برباد کرنے کی نئی راہیں نکالی ہیں
نئے انداز کے اُس کے ہنر بھی دیکھتے جاؤ

تباہی کے مری دیکھے ہیں تم نے بارہا منظر
جو باقی رہ گئی تھی وہ کسر بھی دیکھتے جاؤ

کسی کا جل رہا ہے گھر مرے گھر میں ہے طغیانی
ادھر بھی دیکھتے جاؤ ادھر بھی دیکھتے جاؤ

کوئی کہتا نہیں دیکھو نہ تم آبادِ منزل کو
بنایا ہے جسے صحرا وہ گھر بھی دیکھتے جاؤ

بنی ہے جان پر میرے کوئی دم کا ہیں مہماں ہوں | ذرا ٹھہرو مرا حالِ دگر بھی دیکھتے جاؤ
مری بے چینیاں راتوں کو اکثر تم نے دیکھی ہیں | خدا کا واسطہ میری سحر بھی دیکھتے جاؤ
رقیبوں پر تو غصہ تم نے اُس ظالم کا دیکھا ہے | غریبوں سے تم اُس کی درگزر بھی دیکھتے جاؤ

غزل کے پردہ میں کہہ دو نظامی دردِ دل اپنا
بگڑ بیٹھے نہ وہ اُس کی نظر بھی دیکھتے جاؤ

۶ رد سمبر ۱۹۴۱ء

دے دو دنیا سے کام رہنے دو | میرا بدنام نام رہنے دو
اُف کروں کیا مجال ہے میری | مجھ کو اپنا غلام رہنے دو
میں شکایت کروں ارے توبہ | مجھ پہ یہ اتہام رہنے دو
کیوں قفس سے مجھے ہٹاتے ہو | کوئی دن تو قیام رہنے دو
راس زنداں کی ہے ہوا مجھ کو | وہیں میرا مقام رہنے دو
نہیں فانی یہ دردِ کی دنیا | اس پہ مہر دوام رہنے دو
دو بدو بات ہو تو بات بنے | یہ سلام و پیام رہنے دو
وہ جو وعدہ ہے ہو ابھی پورا | اپنی تم صبح و شام رہنے دو
میں سمجھتا ہوں آپ کے فقرے | مجھ سے ایسے کلام رہنے دو
میٹھی باتیں مجھے نہیں بھاتیں | تم مجھے تلخ کام رہنے دو
رکھو اپنی صراحی زریں | میرا ٹوٹا سا جام رہنے دو

ساری رسمیں پرانی اچھی ہیں ‏— تم نیا انتظام رہنے دو
جانتا ہوں گلی کو میں اُن کی ‏— دور ہی سے سلام رہنے دو
مجھ سے کہتے ہیں جان دو اپنی ‏— یہ بھی ہے کوئی کام رہنے دو
کب وفا میری مشتبہ ٹھہری ‏— جاں نثاروں میں نام رہنے دو

تم نظامی بنے ہو کیا معنی
نام اپنا انتظام رہنے دو

۸ دسمبر ۱۹۴۷ء

مسکراتی ہوئی کیوں یادِ صبا آئی ہے ‏— کیا اسیروں کی رہائی کی خبر لائی ہے
دیکھ کر سوئے قفس پیرِ مغاں کہتا ہے ‏— یہ غلط ہے کہ خزاں جا کے بہار آئی ہے
کون کہتا ہے کیا اُس نے ترحم زرہا ‏— ظلم کے شوق میں صیّاد کی انگڑائی ہے
اُس کے تیور ہیں وہی اُس کا وہی ہے غصہ ‏— دلِ مجروحوں سے وہی اُس کی صف آرائی ہے
مجھ کو صیاد نے آزاد قفس سے تو کیا ‏— قیدِ غم کی وہی ذلت وہی رسوائی ہے
کچھ خبر بھی ہے تمہیں کچھ تمہیں معلوم بھی ہے ‏— اُس کا کیا قصد ہے کیا اُس نے قسم کھائی ہے

کر دیا گھر مرا برباد تو فرماتے ہیں ‏— اِس بیاباں میں تقدیر ہمیں لائی ہے
دیکھنے والے شہیدِ نگہِ ناز ہوئے ‏— خود تماشا ہے وہ اور خود ہی تماشائی ہے
میں نے پوچھا تھا کہ جینے کی ہیں کیا کیا راہیں ‏— ہنس کے کہتا ہے کہ کیا تیری قضا آئی ہے

غیر کی بزم میں بدنام کیا خوب کیا
آپ جو کچھ بھی کہیں آپ کی بن آئی ہو
سمجھیں چاہیں بھی تری زرتے طعنے بھی ہے
دل سادات کا ہاں اب تو تمنائی ہو
میری فریاد کو سُن کر جو کہا تو یہ کہا
یوں ہی روتا ہو وہ مجنون ہو سودائی ہو

نوحۂ غم تو ہو شادی کا ترانہ نہ سہی
تعزیت میں مری یہ انجمن آرائی ہو
دردِ دل کہنے کو تیار ہیں کہنے والے
اُس کے دربار میں کہتے ہیں کہ شنوائی ہو
وہ بھی کہتے ہیں جو ہونا ہو ابھی ہو جائے
صبر اُس کو نہ ہمیں تابِ شکیبائی ہو
مجھ سے تو دور بھی ہو اور مرے پاس بھی ہو
تیری تصویر مرے دل میں اتر آئی ہو
عمر گذری ہو ترے در پہ مصیبت سہتے
غیر سے کچھ نہ غرض ہو نہ شناسائی ہو
ہو گوارا مجھے دشمن کی خوشامد تو یہ
یہ ترا وہم ہو یا یہ تری دانائی ہو

بیوفائی کا نظامی پہ ہے الزام غلط
آپ کے سر کی قسم آپ کا شیدائی ہو

۱۲ دسمبر ۱۹۴۱ء

یہ غلط ہو کہ تمہارا میں وفادار نہیں
کیا میں برگشتہ ہوں ہرگز نہیں سرکار نہیں
آپ کہتے ہیں کہ دشمن سے ہو سازش تیری
جھوٹے الزاموں کے سننے کو میں تیار نہیں
غیر سے جب میں ملا آپ کی مرضی سے ملا
یہ اگر جرم ہو، اس سے مجھے انکار نہیں
اپنی محفل سے نکالا ہو مجھے خوب کیا
آپ کے در کی ہوا مجھ کو سزاوار نہیں

آپ کے دل میں اگر کھوٹ ہے میں کیا جانوں
دل مرا صاف ہے میں آپ سے بیزار نہیں

آپ کو کہتے ہوئے میں نے یہ کانوں سے سنا
ایسے غدار سے کچھ ہم کو سروکار نہیں

حکم محکم ہے کہ بس جائیے ابھی موضعیت
اس سے بڑھ کر تو کوئی آپ کا تیمار نہیں

دلِ نازک کو مرے ٹھیس نہ پہنچا میں حضور
میرے سرکار نہیں اے مرے سرکار نہیں!

اس کو دیکھا ہے نظامی نے بھری محفل میں
کون کہتا ہے وہ دیوانہ ہے ہشیار نہیں

۷ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء

آپ نے معجزۂ زلفِ دوتا دیکھ لیا
پیچ میں اُس کے ستمگر کو پھنسا دیکھ لیا

نا رے اندازی یہ اپنی جو کبھی تھے مغرور
تیر ہو جاتا ہے اُن کا بھی خطا دیکھ لیا

نہ جفا ہے نہ ستم ہے نہ ستمگر باقی
ظلم کا نام ہے کس طرح مٹا دیکھ لیا

کل وفاداری پہ جو ناز کیا کرتے تھے
وہ مٹے اور مٹا نامِ وفا دیکھ لیا

عیش میں جس کو نہ بھولے سے خدا یاد آیا
آج اُن کو بھی اسے مصروفِ دعا دیکھ لیا

لوگ کہتے ہیں غریبوں کا خدا ہوتا ہے
وقت جب ہم پہ پڑا ہم نے خدا دیکھ لیا

غلطی تھی جو وفادار اسے سمجھے تھے
اب تو پہچان لیا جان لیا دیکھ لیا

جلوہ قہر و غضب کا تو ہے اکثر دیکھا
اب تو الطاف کا بھی نشو و نما دیکھ لیا

آئینہ دیکھ کے دیکھا جو مجھے جھپ گئے
میں نے پوچھا تھا کہ آئینہ میں کیا دیکھ لیا

زیست اور مرگ کا طے ہو گیا جھگڑا سارا
بسترِ مرگ پہ جب اُن کو کھڑا دیکھ لیا

وہ پشیمان ہیں گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں
ان کی توبہ کا نظامی نے مزا دیکھ لیا

۲۰ جولائی ۱۹۴۲ء

مُردنی سی چھائی ہے زندہ دلی باقی نہیں
جل ہی آجاتے کا نیرے ایک تمرّیہ بھی تو ہے

آج جس کو ہے وفا دشمن کا دے رکھا لقب
کل کہے گا قول وہ پورا خبر یہ بھی تو ہے

شور و شر برپا کیا وہ درد سے چلا اٹھا
ہاں مری خاموش آہوں کا اثر یہ بھی تو ہے

آپ میرے روٹھ جانے سے نہ ہوتے مشتعل
گر سمجھ لیتے حقیقت میں بشر یہ بھی تو ہے

اُٹھتی ہے جب ٹیس فوراً چھپ جاتا ہے مجھے
چھپ چھپا ہستام ہے درد جگر یہ بھی تو ہے

رحم کرتا ہے کبھی وہ ظلم ڈھاتا ہے کبھی
ہاتھ ہیں اس کے رہوں مد نظر یہ بھی تو ہے

میٹھی باتوں میں نہ اسکی ہے عمل کا شائبہ
صرف لفاظی سے خوش کرنا ہنر یہ بھی تو ہے

چکنی چپڑی باتیں اور صیاد کا مکر و فریب
توڑ ڈالوں گا قفس میں اس کو ڈر یہ بھی تو ہے

۳ ستمبر ۱۹۴۲ء

یہ دلداریاں سب آزاریاں ہیں
یہ عیاریاں ہیں یہ عیاریاں ہیں

ادھر شوق میں اس کے سینہ سپر ہیں
ادھر جورِ تازہ کی تیاریاں ہیں

جو ایفائے وعدہ کی ہیں نرم شرطیں
وہ آسانیاں بھی تو دشواریاں ہیں

مجھے کر کے بسمل وہ ہنس کر یہ بولے
یہ مجبوریاں ہیں یہ لاچاریاں ہیں

بناوٹ نے اُس کی کیا دل کو غارت
دل آزاریاں یہ طرحداریاں ہیں

زمانے نے کھایا ہے کچھ ایسا پلٹا
وفاداریاں بھی جفاکاریاں ہیں

تنفر بھی ہے اور اظہار الفت
یہ بیزاریاں کیسی بیزاریاں ہیں

نہ پوچھو کہ لایا ہوں میں نذر میں کیا
خطاکاریاں ہیں گنہ گاریاں ہیں

خدا کا دیا غم ہے کھانے کو وافر
فقط نام کی اپنی ناداریاں ہیں

لگاتے ہیں وہ تیر ہنس ہنس کے دل پر
نہ ہی ان کی پہلی سی مکاریاں ہیں

وہ بیدار تو ہیں مگر سو رہے ہیں
یہ بیداریاں خاک بیداریاں ہیں

پڑا وقت ان پر تو گھبرا گئے وہ
دل زار کی تازہ بربادیاں ہیں

سوا اس کے صیاد کے گھر میں کیا ہے
قفس کھل رہا ہے گرفتاریاں ہیں

ستمگر یہ کہتا ہے میں ہی ستم ہوں
مجھی سے تو پیدا ستم گاریاں ہیں

سکوں میں یہ طوفان آیا ہوا ہے
خموشی میں کیوں گرم بازاریاں ہیں

نظامی کی فرصت بھی مصروفیت ہے
یہ بیکاریاں اس کی باکاریاں ہیں

۲۸ ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء

تھے ستم اس کے مگر اب وہ ستمگار نہ تھا
تھی ادا اس کی مگر اب وہ اداکار نہ تھا

اب نہ ہی نام جفا کا نہ ادا کا باقی
گرم اس جنس کا گویا کبھی بازار نہ تھا

جشن جمشید سے بڑھ کر تھی کسی کی محفل
عیش ہی عیش تھا کچھ غم سے سروکار نہ تھا

غیر کے ہاتھ سے ٹوٹا جو مصیبت کا پہاڑ
آپ کو اس کا گماں بھی کبھی سرکار نہ تھا

کچھ ہوا ایسی چلی کھل گئیں سب کی آنکھیں
اک فقط میں ہی تری بزم میں بیدار نہ تھا

اپنے عاشق کو سمجھتے رہے تم دیوانہ
کیا وہ مطلب کا بھی چوکس نہ تھا ہشیار نہ تھا

چاہتا تھا کہ دوانہ وہ بلا سے چھوٹے
مدعا اس کے سوا تو کوئی زنہار نہ تھا

یہ تمنا تھی کہ تیلی ہو قفس کی ڈھیلی
آپ کی قید میں رہنے سے تو انکار نہ تھا

بیوفائی کے یہ آداب سکھائے کس نے
آپ کے سر کی قسم میں کبھی غدار نہ تھا

جو فدائی تھا کبھی اُس پہ ہو نفرت کا گماں
تم ہی ایمان سے کہہ دو وہ وفادار نہ تھا

منصفی آپ کی اور آپ کا ایمان کیا خوب
اس خطا پہ مجھے مارا کہ خطاوار نہ تھا

یہ تو معلوم ہی جیل دیکھے کیا مجھکو اسیر
آپ کے ظُلم سے لیکن میں خبردار نہ تھا

یہ نظامی ہے وہی تھا جو کبھی تم پہ فدا
اس سے بڑھ کر کوئی دُنیا میں گنہگار نہ تھا

۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۲ء

جی بھر کے خوب ظُلم و ستم مُجھ پہ ڈھائیے
چھُریوں کو تیز کیجئے خنجر منگائیے

نکلے زباں سے اُف تو زباں کاٹ لیجئے
سرتابی گر کروں تو مرا سر اُڑائیے

آپ اور مجھ کو اپنی غلامی سے دیں نجات
وعدہ نہ کیجئے نہ قسم اس کی کھائیے

میں اور عاجزی سے کروں عرض مُدعا
میں یہ کہوں کہ قید سے مُجھ کو چھُڑائیے

کب مانگنے سے ہوتی ہیں آزادیاں نصیب
بیکار ہی سوال عبث گڑگڑائیے

میں جان سے گیا یہی مرضی خدا کی تھی   کہتا ہی کون آپ سے آنسو بہائیے

بھولیں کبھی نہ آپ نظامی کے قول کو
دشمن کے سبز باغ سے دھوکا نہ کھائیے

۲۸ اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء

خوب جی بھر کے ستا لے ستم ایجاد مجھے   نہ میں تڑپوں گا نہ ہو رخصت فریاد مجھے

کیوں وہ پچھتاتے ہیں پچھتانے سے ہوتا کیا ہی   ہاتھ کیوں ملتے ہیں جب کر دیا برباد مجھے

باتیں ہی باتیں ہیں وہ قول کا کچا کب ہے   نہ کیا ہے نہ کرے گا کبھی آزاد مجھے

گوشۂ دل میں خیالات کا ہے یہ ہجوم   ہو یہ اُجڑا ہوا گھر خانۂ آباد مجھے

جب جوانی ہی جنہوں نے دیا تجھ کو فریب   وہ گھڑی یاد ہے اب تک دلِ ناشاد مجھے

کھینچ دی میں نے تصور میں کسی کی تصویر   کیوں نہ کہنے لگیں وہ پیار سے بہزاد مجھے

ہچکیوں کا نہیں بے وجہ نظامی عالم
لوگ کہتے ہیں کسی نے ہے کیا یاد مجھے

۲ دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء

یہ تو اُس کے ستم کے ہیں چھینٹے   کس نے دیکھا ہی شاہکار ہنوز

وہ اور ایفائے عہد اے توبہ   نہیں کچھ اس کا اعتبار ہنوز

راہ و رسمِ وفا وہ کیا جانے   آپ کو کیوں ہے انتظار ہنوز

آرزو اور وہ کرے پوری   میرے ارماں ہیں سوگوار ہنوز

۲ر دسمبر ۱۹۴۲ء

وہ رکھے مجھ پہ اعتماد غلط — دل میں ہے اُس کے کچھ غبار ہنوز
مجھ کو جب یاد کیوں کرے آزاد — نہیں آئی یہاں بہار ہنوز
جام جم کا ہوا ہے اتنا دور — مگر آنکھوں میں ہے خمار ہنوز
جب "نہیں" اُس کی سُن چکے ہر بار — پھر ہو کیوں تم امیدوار ہنوز
اک جھلک اُس کی ہم نے دیکھی تھی — ہے نگہ میری بے قرار ہنوز

وہ نظامی کو کر گیا بے خود
نہیں ہرگز وہ ہوشیار ہنوز

۲ر دسمبر ۱۹۴۲ء

رنگ تعمیر ہوتے جاتے ہیں — ہنسنے والے بھی رونے جاتے ہیں
خواب کا نام ایسی بیداری — جاگنے والے سونے جاتے ہیں
جن کو دانائے دہر کہتے تھے — عقل وہ اپنی کھوتے جاتے ہیں
اپنے ہم چشموں میں تھا جنکا وقار — آبرو وہ ڈبوتے جاتے ہیں
قتل عاشق پہ ہیں پشیماں بھی — خون میں ہاتھ دھوتے جاتے ہیں

خود ہی کشتہ کیا نظامی کو
ساتھ میت کے روتے جاتے ہیں

۷ رفروری ۱۹۴۳ء

وہ مجھ پہ مہرباں حد سے سوا معلوم ہوتا ہے
کرم ہنگامہ جور و جفا معلوم ہوتا ہے

ہماری طرح سے وہ مبتلا معلوم ہوتا ہے
محبت سے کچھ اس کا واسطہ معلوم ہوتا ہے

محبت کا جو ہے بارِ گراں جھٹکیں اسے چل کر
دلِ نازک پہ وہ اک بوجھ سا معلوم ہوتا ہے

گئے وہ دن کہ میٹھی میٹھی باتیں اس کی ہوتی تھیں
اب اندازِ بیاں اس کا بنا معلوم ہوتا ہے

نہیں کا لفظ سننے کو تو اکثر سنتے رہتے ہیں
زباں سے آپ کی وہ کچھ بھلا معلوم ہوتا ہے

خدا جانے نبھے گی اس سے اپنی دوستی کیونکر
وہ پہلے دن سے ہم کو بے وفا معلوم ہوتا ہے

یہ خوش فہمی ہے وہ تعریف کو بھی ذم سمجھتے ہیں
اگر اچھا بھی کہتا ہوں برا معلوم ہوتا ہے

لیا تھا دل تو کہتے تھے کہ یہ تیری امانت ہے
تقاضا واپسی کا اب برا معلوم ہوتا ہے

میں زنجیروں کی جھنکاروں کو اک نغمہ سمجھتا ہوں
جنونِ عشق کا یہ معجزہ معلوم ہوتا ہے

یہ اچھا ہے نظامی قید میں گھٹ گھٹ کے مر جائے
یہی اے دیکھئے ان کا مدعا معلوم ہوتا ہے

۲۸ رفروری ۱۹۴۳ء

کہہ گئی مجھ سے یہ اس کی نگہہ ناز ابھی
کھولنا میری محبت کا نہ تم راز ابھی

کیا بتاؤں میں تجھے کیسے شبِ وصل کٹی
دم تو لینے دے مجھے اے مرے دلساز ابھی

سوزِ دل کی مری حالت کو نہ پوچھو مجھ سے
خود ہی بول اٹھے گا ٹوٹا ہوا یہ ساز ابھی

کیا خبر مجھ کو کہ تقدیر میں لکھا کیا ہے
پہلی منزل ہے محبت کی، ہے آغاز ابھی

یہ تو ممکن ہے حسینوں کے بھلا دیکھ جلوے
حسن کے آپ نے دیکھے نہیں انداز ابھی

سحر کاری کا نظامی کی ہے کیوں اس کو یقیں
جانتا ہی نہیں اس کو وہ فسوں ساز ابھی

ستمبر ۱۹۴۳ء مطابق شوال ۱۳۶۲ھ

مصیبت کا جب یہ زمانہ ہے ساقی
تو پھر عید کا کیوں یہ میلا ہے ساقی

تباہی نے ویرانہ اس کو بنایا
مرا گھر نہیں ہے یہ صحرا ہے ساقی

مصیبت میں یہ آمدِ عید گویا
مری بیکسی کا تماشا ہے ساقی

کہوں تجھ سے کیا اپنی آشفتگی کو
تو دانا ہے ساقی تو بینا ہے ساقی

بجھے تشنگی جس سے وہ جام دیدے
سنا ہے کہ تو ظرف والا ہے ساقی

صراحی میں تیری بھرا ہے جو امرت
وہی زندگی کا سہارا ہے ساقی

پلا دے پلا دے ہمیں ہاں پلا دے
ترے ہاتھ میں جام و مینا ہے ساقی

خدا کے لئے بھر دے جامِ تمنّا
یہی عید کے روز کہنا ہے ساقی

تو کیوں ہم کو اپنے بھولا ہوا ہے
یہ پیاسے غریبوں کی دنیا ہے ساقی

یہ ہے میکدہ عام سب کو پلا دے
نہ یاں تفرقہ ہے نہ جھگڑا ہے ساقی

جدائی جدائی جو کہتے ہیں ہر دم
شرارت کا ان کی یہ شوشا ہے ساقی

ترے ساتھ ہیں اور پیرِ مغاں ہے
غلط ہے فقط تو اکیلا ہے ساقی

۲۶ اکتوبر ۱۹۴۳ء

ہمیں دیکھو اور ان کی بدگمانی دیکھتے جاؤ
ہمیں ان کے کرم کی ہیں نشانی دیکھتے جاؤ

دلوں پر تو نہیں قبضہ مگر ہم ان کے بندے ہیں
انوکھے طرز کی یہ حکمرانی دیکھتے جاؤ

بھلے کا پیٹتے ہیں جو ہمارے روز نقارہ
عمل سے دور ان کی لن ترانی دیکھتے جاؤ

جنھیں تھی نوعِ انسانی کی ہمدردی کے کل دعوے
ذرا دعووں کی ان کے کامرانی دیکھتے جاؤ

ہوئے ہم جاں بلب پر بات بھی سیدھی نہیں کرتے
گرانی میں یہ ان کی سرگرانی دیکھتے جاؤ

مجالس میں اپنی بخشیں فالیں ساری مرتب ہیں
چھپی لفظوں میں ان کی مہربانی دیکھتے جاؤ

نظامی جانتے ہو تم مآلِ زندگی کیا ہے
قمر کی گور دیکھو قبر فانی دیکھتے جاؤ

۱؎ مولوی قمر الحسن صاحب بدایونی ۲؎ شوکت علی خاں صاحب فانی بدایونی

۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۴ء

ایسا بھی کوئی راز ہے جو رفتہ نہ ہو
ہونے کو ہو جو بات وہ کیوں بر ملا نہ ہو

میرے خدا نے مجھ کو ازل سے دیا ہے غم
جیسا مرا خدا ہے کسی کا خدا نہ ہو

کس سے کہیں یہ جائے کہ گم گشتہ راہ ہیں
منزل کا کیا پتہ ہو جہاں رہ نما نہ ہو

بحرِ جہاں میں سخت تلاطم بپا ہے آج
ڈر ہے کہ اس کی تہہ میں مرا ناخدا نہ ہو

جب آفتاب کی ہے زمانہ میں روشنی
ممکن نہیں کہ گھر میں ہمارے ضیا نہ ہو

دُنیا میں انقلاب ہوا اور ہم یونہی رہیں
سب کا خدا ہو اور ہمارا خدا نہ ہو

ہوتے ہیں مشورے کہ وہ دیں گے تسلیاں
بہلانے کو ہمارے کوئی ٹوٹکا نہ ہو

باتیں ہوئیں جو اُن سے تو کہتے رہے یہی
شکوہ نہ غیر کا ہو ستم کا گلا نہ ہو

آئیں زبان پر نہ قفس کی شکایتیں
آزادی بھولے سے بھی کبھی مدعا نہ ہو

مجبور ہم ہیں تابِ سخن بھی نہیں رہی
دُنیا مگن ہے اس کا کوئی تذکرہ نہ ہو

کہتے تھے وہ جُدا رہیں اور دل ملے رہیں
کہتا تھا میں کہ دل تو ملیں تفرقہ نہ ہو

اُن کو یہ ضد تھی بات نہ ان کی گھٹی رہے
اس پر اڑے ہوئے تھے کہ میرا کہا نہ ہو

کہنے کو تھے وہ راہِ محبت میں میرے ساتھ
لیکن یہ دیکھتے تھے کوئی دیکھتا نہ ہو

عمرت دراز باد ستم یونہی ڈھائے جا
میری دعا یہ حق میں ترے بد دعا نہ ہو

نامِ خدا ہوا تو ہے ذوقِ سخن تجھے
بگڑے نہ نظم تنگ کہیں قافیہ نہ ہو

معلوم ہے حقیقتِ مستی کی کیفیت
سمجھائیے اُسے جو تمہیں جانتا نہ ہو

اچھا نہیں نظامی تو اچھا یونہی سہی
لیکن خدا کرے وہ کسی کا برا نہ ہو

۷ر دسمبر ۱۹۴۵ء

حکومت ملنے پر بوئے محبت آ ہی جاتی ہے
"خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے"

بگڑتا دیکھ کر مجھ کو تعجب سے وہ کہتے ہیں
غلاموں کو بھی کہتے ہیں حرارت آ ہی جاتی ہے

ستانے کا مزا لو وہ دور بیٹھے بیٹھے لیتے ہیں
جب آنکھیں چار ہوتی ہیں ندامت آ ہی جاتی ہے

ڈراتا بھی ہے دھمکاتا بھی ہے وعدے بھی کرتا ہے
سمجھ میں میری سب اسکی شرارت آ ہی جاتی ہے

ستمگر بھی ہے ظالم بھی ہے وہ لیکن جفا اسکی
شکستہ دل ہیں میرے بن کے ہمت آ ہی جاتی ہے

خدا آباد رکھے میرے دنیائے تصور کو
جھلک کر اس میں ان بیدردوں کی صورت آ ہی جاتی ہے

دکھاتا ہے وہ چہرہ مل کے جب اسلام کا غازہ
مسلماں ہیں بھی ہوں آخر طبیعت آ ہی جاتی ہے

وفاداروں کے زمرے میں اگرچہ نام ہے میرا
زباں پر پھر بھی بھولے سے شکایت آ ہی جاتی ہے

نظامی اور گھبرائے وہ مایوسی و ماتم سے
وہ دل پایا ہے اس نے جسمیں جرأت آ ہی جاتی ہے

فروری ۱۹۴۶ء

نہیں کچھ ہوش رہتا ہے انھیں جب دم بھرتے ہیں
خدا جانے مجھے غصے میں کیا کیا نام دھرتے ہیں

مری مظلومیت بھی سارے عالم میں مسلّم ہے
انھیں کیا فائدہ ہے اس کی کیوں تاویل کرتے ہیں

کہاں اب ہم میں جُرأت جو مظالم ان کے دہرائیں
ہمیں کاٹا ہے جب سے سانپ نے رسّی سے ڈرتے ہیں

وہ کہتے ہیں نہیں پورا ہوا تو آپ کی قسمت
ہمیں وعدے سے کب انکار ہے ہم کب مکرتے ہیں

چمن بھی تو ہمارا کچھ قفس سے کم نہیں ہرگز
قفس کو لوگ ناحق کس لئے بدنام کرتے ہیں

زباں وہ بات کو کہنے سے پہلے کاٹ لیتے ہیں
مگر جو کہنے والے ہیں وہ پھر بھی کہہ گذرتے ہیں

تہہِ خنجر بھی تجھ پر مرنے والے اُف نہیں کرتے
بڑی ہمت ہے ان کی وہ تو مرجانے پہ مرتے ہیں

مرے احوال کی پرسش کو اپنا آدمی بھیجا
یہاں سب خیریت ہے بے سبب وہ فکر کرتے ہیں

ستم رانی کا چولا ان کو سچ مچ زیب دیتا ہے
عبث تصویر میں معصومیت کا رنگ بھرتے ہیں

بگڑ جاتا ہے نقشہ ہوتی ہیں جب پیار کی باتیں
مگر غصّہ میں اُن کے حُسن کے تیور نکھرتے ہیں

تلوّن کی ادا اُن کی نظامی آپ نے دیکھی
کبھی زلفیں بکھرتی ہیں کبھی گیسو سنورتے ہیں

۱۶ مارچ ۱۹۴۶ء

ہے خبر وہ میرے گھر رونق فزا ہونے کو ہے — لوگ کہتے ہیں کہ اب عہدِ وفا ہونے کو ہے

نامہ و پیغام تو بیکار ہو کر رہ گئے — یہ بہت اچھا ہے اُن کا سامنا ہونے کو ہے

تن پہ کپڑا ہے نہ کھانے کیلئے نانِ جویں — ایسے میں آجائیں تو کیا جانیں کیا ہونے کو ہے

اس کی جو چالیں تھیں فرسودہ نمایاں ہو گئیں — سُنتے ہیں اب شعبدہ کوئی نیا ہونے کو ہے

لُطف کے پردے میں چھپ چھپ کر جو ڈھاتا تھا ستم — اب سرِ بازار اس کا تذکرہ ہونے کو ہے

ظُلم کا تیرے خموشی سے وہ دیں شاید جواب — تیرے مظلوموں میں ایسا مشورہ ہونے کو ہے

میرا مسلک ہے کہ ہو ہر ظلم پر سینہ سپر — وہ سمجھتے ہیں کہ مصروفِ دعا ہونے کو ہے

یہ وہی مسلک ہے جو دشمن کو کر دیتا ہے زیر — یہ وہی ہے راستہ جس سے بھلا ہونے کو ہے

زندگی ہم کو نئی بخشے گا یہ مسلک ہے وہ — از سرِ نو اپنی پھر نشو و نما ہونے کو ہے

اے نظامی کیا عجب ہے راہ پر آجائے وہ
سُن لیا ہے اس نے ترکِ مدعا ہونے کو ہے

۲۲ مارچ ۱۹۴۶ء

قول مجھ کو نہ کچھ دیئے ہوتے
عہد و پیماں نہ یوں کئے ہوتے

عہد کا توڑنا قیامت ہی
راز وہ یہ سمجھ لئے ہوتے

بد مزاجی کا لطف اور دشمن
تم بُرے بھی ہمارے لئے ہوتے

دوسرا اُن کی قدر کیا جانے
یہ ٹھوکرے مجھے دیئے ہوتے

بے پئے ہی غضب کی ہی مستی
تم ڈھاتے اگر پئے ہوتے

رات جو غیر سے ہوئیں باتیں
مجھ سے وہ راز کہہ دیئے ہوتے

وہ نہ کاٹے زبان یا کاٹے
ہونٹ میرے مگر سئے ہوتے

میری میّت پہ آکے وہ بولے
کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے

تم نے ٹھکرا دیا نظامی کو
اُس کے دو لفظ سُن لئے ہوتے

۲۸ مارچ ۱۹۴۶ء

یہ تو ممکن ہو کہ راس آئے نہ تدبیر کبھی
یہ غلط ہو کہ بگڑ جاتی ہو تقدیر کبھی

پا بہ زنجیر ہوں لیکن نہیں رُکتا ہو قدم
ایسی دیکھی نہیں ہم نے کوئی زنجیر کبھی

ہو کوئی پیچ نہ اس میں کوئی ابہام نہ ہو
اس کی دیکھی نہیں ایسی کوئی تحریر کبھی

بات تو بات نوشتے بھی بدل جاتے ہیں
اس کا کیا شکوہ جو کر بیٹھے تھے تقریر کبھی

کیا ہوا یہ کہ وہ گھبرائے ہوئے آئے ہیں
میرے نالوں میں تو ایسی نہ تھی تاثیر کبھی

خانۂ دل کو میں ویران کروں ای توبہ
کسی تخریب سے ہوتی نہیں تعمیر کبھی

بارہا خواب میں دیکھا کئے آزادی کو
پر ہوا خواب نہ شرمندۂ تعبیر کبھی

ہم نے اُس شوخ کو سو بار پلٹتے دیکھا
جے کی آواز کبھی نعرۂ تکبیر کبھی

مصلحت کیش اداؤں کو کوئی کیا سمجھے
پردہ پوشی کبھی کرتے ہیں تو تشہیر کبھی

میری آزادی کی عجلت ہو انھیں خیر تو ہو
یہ وہی ہیں جو روا رکھتے تھے تاخیر کبھی

اب تو ہر شعر نظامی کا کشش رکھتا ہو
ایسی جذبات کی کھینچی نہیں تصویر کبھی

مارچ ۱۹۴۶ء

کہنے کو آئے ہیں کچھ بات نہ کرنے والے
آج ہم جان گئے شاہد ہیں گزرنے والے

تم سلامت رہو اللہ کرے عمر دراز
مجھ پہ ہر روز نئی تہمتیں دھرنے والے

پہلے وعدہ کیا اب کہتے ہیں وعدہ کیسا
ہم نے دیکھے ہی نہیں ایسے مکرنے والے

جن کو ناکارہ و نا اہل کہا کرتے تھے　　ان کے جوہر جو چھپے تھے ہیں نکھرنے والے

دھمکیاں آپ کی سرکار مزا دیتی ہیں　　ان ڈراووں سے نہیں ہم کبھی ڈرنے والے

تجھ پہ قربان ہیں، کہہ کہہ کے لبھایا اس کو　　کیسے خوش بخت ہیں صدقے میں اترنے والے

پڑھ چکے آپ کی آئینِ محبت کی کتاب　　خوشنما چند ورق ہیں، وہ بکھرنے والے

تم عیادت کو تو آئے ہو مگر یہ نہ کہا　　"کیا گزرتی ہے تری جان پہ مرنے والے"

اپنی نظروں سے جنھیں تم نے گرا رکھا تھا　　ہے خبر گرم کہ ہیں وہ بھی ابھرنے والے

ان کو اندیشہ ہے دامن نہ الجھ جائے کہیں　　اسی باعث سے ہیں وہ راہ کترنے والے

جان پر کس کی بنے کون مرے کون جئے　　آج سنتے ہیں وہ ہیں بننے سنورنے والے

لگ گئی چپ جو نظامی کو تو ہنس کر بولے
باتوں باتوں ہی میں مرجاتے ہیں مرنے والے

نعتیہ نظمیں

۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۴۹ھ کو نبی خانہ بدایوں میں کہی گئی
اگست ۱۹۳۰ء

مرنا ہمیں دشوار ہے جینے سے خفا ہم
اس دور میں ہیں اپنی خرابی کی بنا ہم

ہیں بھی کہ نہیں تذکرہ یہ کرتے ہیں باہم
کیا چیز تھے دُنیا میں کبھی ہوگئے کیا ہم

آشفتہ سری نوحہ گری سے ہے ظاہر
ہیں مسلم خستہ جگر و دردِ نوا ہم

روتا ہے جو سُنتا ہے جو فریاد ہماری
شاید کسی ٹوٹے ہوئے دل کی ہیں صدا ہم

کھنچی ہے ہر اک نالہ نے اندوہ کی تصویر
ہیں عالمِ ہستی میں گرفتارِ بلا ہم

تھا نام کبھی نبض شناسانِ جہاں میں
بیمار ہیں اب ڈھونڈتے پھرتے ہیں دوا ہم

آفات ہیں ہم جن کیلئے سینہ سپر ہیں
ان سے بھی تو رکھتے نہیں اُمید وفا ہم

کچھ اور ہی احوال ہے ابنائے جہاں کا
کچھ اور ہی پاتے ہیں زمانے کی ہوا ہم

شیرازۂ احباب ہو دم بھر میں پریشاں
ہو جائیں الگ دل سے جو بیٹھیں کبھی باہم

بیگانگیٔ غیر کا شکوہ نہ کریں گے
ہے یہ وہ زمانہ کہ ہیں اپنوں سے جُدا ہم

اقبال گیا علم و ہنر ہوگئے رُخصت
ہے عقل کہاں پوچھتے پھرتے ہیں پتا ہم

حق گوئی میں پروا نہ ہوئی جان کی مطلق
کرتے رہے یہ فرض دلیری سے ادا ہم

اب جُرأت و اخلاق ہے اغیار کا حصّہ
میدانِ صداقت میں کُجا غیر کُجا ہم

کتنے ہی کرے چرخ ستم اُف نہیں کرتے
مشتاقِ جفا وہ ہیں طلبگارِ وفا ہم

اک شے جو تملّق ہے کہیں اور نہ ڈھونڈو
مخصوص غلاموں سے ہے وہ رکھتے ہیں یا ہم

کیا غم ہی اگر عزّت و دولت نہ ہو حاصل
صد شکر کہ ہیں اُمتِ محبوبِ خدا ہم

آخر تو اُنھیں کے ہیں بُرے ہیں کہ بھلے ہیں
ہیں نامِ محمدؐ پہ دل و جاں سی فدا ہم

بگڑی ہوئی بن جائے کرم کی جو نظر ہو
شاہنشا کو بن ہیں وہ اور گدا ہم

جو حکم ہی اُن کا وہ ہی ایمان ہمارا
جو بات ہی اُن کی وہ سمجھتے ہیں بجا ہم

ہیں آج بھی ہم گنبدِ خضرا کے فدائی
برسوں سی ہیں گو قربِ مدینہ سی جُدا ہم

دیکھیں ہمیں لے جائے گی کس سمت اُڑا کر
لے خاک بھی اب ہوگئے ای بادِ صبا ہم

کرتوت ہیں سب اپنے ہی ہاتھوں کی نظامی
کہتے ہیں عبث گردشِ قسمت کا گِلا ہم

اگست ۱۹۳۳ء

ای نظامی آپ کی جادو بیانی کیا ہوئی
کچھ تو کہئے لگ گئی چپ آپ کو کیوں اس قدر

کچھ خبر ہی یا نہیں پھر موسمِ گُل آگیا
بُلبُلیں نغمہ سرا گلشن میں ہیں شام و سحر

پھر مسلمانوں کے دل فرطِ مسرّت سی کھلے
پھر نبی خانہ میں ہی عیدِ ولادت جلوہ گر

فیضِ ربِّ ذوالمنن سے بارھویں پھر آگئی
جس طرف دیکھو ہی ذکرِ سیرتِ خیر البشر

جن کے آنے سی جہانِ کُفر کی ظلمت مٹی
ہوگیا طالع یکایک نورِ وحدت کا قمر

جن کی آمد نے کیا لات و ہبل کو سرنگوں
جن کے قدموں نے کیا مُلکِ عرب کو مفتخر

اس خوشی نے غمزدوں کو وقفِ عشرت کردیا
فصلِ گُل کا ہر طرف منظر ہو پیشِ نظر

سال بھر تک جو رہا رنج و الم میں مبتلا
اُس دلِ غمگیں پہ بھی ہی اس مسرّت کا اثر

عیدِ مولد کی یہ ساعت کاش ہو وہ یہ گھڑی — زندگی پائے دوبارہ مسلمِ خستہ جگر
ہر سیہ بختی جو چھائی ایک دم کافور ہو — ہاتھ باندھے سامنے حاضر رہیں فتح و ظفر
گر مشیت ہی یہی ہے یہ قوم ذلت میں رہے — اس سے بہتر تو یہ ہے دنیا سے ہو اس کا سفر
صفحۂ ہستی سے اس کو میٹ دے دورِ زماں — تا نہ ہو اس کی زباں پر الاماں و الحذر
زندگی کیا اس کی عزت جس کی غیروں میں نہ ہو — ساکھ کیا اس قوم کی رکھتی نہ ہو جو مال و زر
جس میں ہمت ہو نہ جرأت ہو نہ کچھ ایثار ہو — بندۂ زر ہو مگر ہو فاقہ مستی میں بسر
جس کا یہ احوال ہو وہ شعر کیا موزوں کرے — اس کی خاموشی بجا ہے جس پہ ہو ایسا اثر
نظم ہے یہ کب نظامی کا فقط معمول ہے — یا دلِ صد پارہ کی ہیں چند قاشیں ماحضر

۲۰؍ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ مطابق جولائی ۱۹۳۲ء

خیر سے آئی ہے پھر عیدِ ربیع الاول — اے دلِ زار نبی خانہ کو چلنا ہے تو چل
سنتے ہیں مسلمِ ناشاد کے گھر شادی ہے — اس کی پونجی میں ہے لے دیکھیے ہی حسنِ عمل
آج کا روز ہے امت کے لیے عید کا دن — کہ تولد ہوئے ہیں آج نبیٔ مرسل
آپ کے نور سے اسلام نے پایا وہ فروغ — جس سے بے نور ہوئے سارے ادیانِ ملل
کعبہ میں نعرۂ تکبیر کی گونجی آواز — ظلمتِ کفر مٹی اور گرے لات و ہبل
نورِ توحید سے ہر ذرہ بنا غیرتِ مہر — ہو گیا ظلمتِ الحاد کا قصہ فیصل
آپ کے خلق کو خالق نے کہا خلقِ عظیم — آپ کی ذات دو عالم میں ہے سب سے افضل
پا گئے بھٹکے ہوئے دین کا رستہ سیدھا — آپ کے نورِ ہدایت نے دکھا دی مشعل

شوق کہتا ہے کہ لکھے جاؤں یونہی نعتِ نبی   دل یہ کہتا ہے کہ طاقت ہے نہ باقی کس بل

نہ وہ جدت ہے نہ جودت نہ ذکاوت نہ اپج   کارفرمائی یہ غمش کی ہے نہ ممارست کا عمل

نام کو موسمِ باراں ہے مگر کچھ بھی نہیں   اودی اودی وہ گھٹائیں نہ گرجتے بادل

موسلا دھار نہ چھینٹا نہ تقاطر کا پتہ   ایسے موسم میں بھلا خاک کھلے دل کا کنول

صرف یہ شعر لکھے چند۔ پئے نذرِ رسول

نہ مخمس نہ مسدس نہ قصیدہ نہ غزل

جون ۱۹۳۵ء

زمانے میں خوشیاں ہیں شادی رچی ہے   ضیا جس سے ظلمت ہٹی ہے

فلک ہے یہ رحمت جو نازل ہوئی ہے   زمیں بھی لرزتی ہوئی تھم گئی ہے

نہیں رنج و غم ہر طرف خرمی ہے   مسرت سے مسرور ہر آدمی ہے

نبی جی کے پیدا ہوئی کی خوشی ہے

خوشی کے لئے سارے عالم کا جی ہے

جو ہے رحمتِ عالمیں شانِ رحمت   غریبوں یتیموں پہ جن کی عنایت

ہوئی عام تہذیب جن کی بدولت   عرب کی ہوئی جس کے ناموں سے شہرت

سکھائی جنہوں نے ہمیں آدمیت   انہیں کا تو ہے آج یومِ ولادت

نبی جی کے پیدا ہوئے کی خوشی ہے

خوشی کے لئے سارے عالم کا جی ہے

بدالیوں میں عید ولادت کا چرچا   نہیں جس میں کچھ دخل جدت کو اصلا
نبی خانہ مدت سے مرکز ہی اس کا   روایات سابق کا اصلی نمونہ
ہی اک شانِ اسلام اس سے ہویدا   نہ میلا نہ ٹھیلا نہ کوئی تماشا

نبی جی کے پیدا ہوئے کی خوشی ہی
خوشی کے لئے سارے عالم کا جی ہی

سہانی ہی کیا صبح صادق کی محفل   یہ روزِ ولادت کی پہلی ہی منزل
اسی شوق میں سب کا بیتاب ہی دل   زیارت ہو آثار حضرت کی حاصل
بر آئی تمنا ہوئی سہل مشکل   مسرت سے کلیاں دلوں کی گئیں کھل

نبی جی کے پیدا ہوئے کی خوشی ہے
خوشی کے لئے سارے عالم کا جی ہے

کھڑکتی ہیں نہ دیگیں ہی دعوت کا ساماں   تکلف نہیں اس ضیافت کی شایاں
نبی خانہ میں آئے ہیں جو مسلماں   وہ ہیں میزباں خود ہی اور خود ہی مہماں
گلے مل کے باہم مناتے ہیں خوشیاں   یہ عیدِ ولادت کی ہیں رنگ رلیاں

نبی جی کے پیدا ہوئے کی خوشی ہی
خوشی کے لئے سارے عالم کا جی ہی

ہوئی ختم دعوت تو رخصت سرا ہیں   جو مداح ہیں اُن کے رستے سوا ہیں
مقرر غزل خوانوں کے ہم نوا ہیں   یہ سب ایک ہی لے میں گرم ثنا ہیں

یہ سب باصفا ہیں یہ سب باخدا ہیں یہ جشنِ ولادت پہ دل سے فدا ہیں
نبی جی کے پیدا ہوئے کی خوشی ہے
خوشی کے لئے سارے عالم کا جی ہے

یہ مولد کے جلسے ہیں سیرت کے جلسے محبت کے جلسے اخوت کے جلسے
بڑی شان والے یہ نعمت کے جلسے مبارک ہیں یہ خیر و برکت کے جلسے
نظامی ہیں پہنچا یہ رحمت کے جلسے مسرت کے جلسے ولادت کے جلسے
نبی جی کے پیدا ہوئے کی خوشی ہے
خوشی کے لئے سارے عالم کا جی ہے

۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۴ھ مطابق جون ۱۹۳۴ء

وہ دورِ خوش وہ صبحِ ولادت حضور کی رنگ شفق میں موج شرابِ طہور کی
محوِ غبارِ حسن ادا برقِ طور کی ذرات میں امنگ تھی کیف و سرور کی
منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

نظارہ گلستاں کا سراپا نگار تھا کھیتی ہری تھی جوش پر ابرِ بہار تھا
کیا دلربا عروسِ چمن کا سنگھار تھا پھولوں کا حسن قدرتِ پروردگار تھا
منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

ایمائے حق یہ تھا کہ حقیقت ہو بے نقاب — روشن جہاں ہو جلوۂ وحدت ہو بے نقاب
آئینۂ کمال میں قدرت ہوئی بے نقاب — انسان کے لباس میں رحمت ہو بے نقاب

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

طوطی خموش ہو لب گویا کے سامنے — سنبل خجل ہو زلف سمن سا کے سامنے
آب آب آئینہ رخ زیبا کے سامنے — شمشاد منفعل قد رعنا کے سامنے

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

میلاد کی خوشی ہو زمانہ میں جابجا — پیدا ہوئے ہیں آج شہنشاہ دوسرا
ظلمت جو کفر کی تھی ہوئی ایکدم فنا — دنیا کے گوشے گوشے سے آنے لگی صدا

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

بندگی کی آن شاہی کی سلطنت سے جا ملی — ذرے کی قدر مہر کی عظمت سے جا ملی
پستی زمیں کی عرش کی رفعت سے جا ملی — انسانیت کی شان خلافت سے جا ملی

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

پہلے یہ کچھ نہ تھا نہ ملائک انس و جاں — تھی ذات حق فقط نہ زمیں تھی نہ آسماں

تھی

تیرا ہی سب طفیل ہے یہ بزم کن فکاں — تیرے ہی دم قدم سے ہے تخلیق دو جہاں

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

شان خدا امام زماں ہادی سبل — سردار کائنات ہو مختار جزو و کل
تو نے نظام دہر کو پلٹا بشہ رسل — اسلام کی چمک سے ہوئی شمع کفر گل

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

میلاد مصطفیٰ کا جو اک راز تھا خفی — عقدہ یہ حل ہوا اس کی نظامی کو فکر تھی
کوشش یہ کارگر نہ کسی طرح جب ہوئی — غالب کی یہ صدا مرے کانوں میں آگئی

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

۱۲ ربیع الاول مطابق ۵ فروری ۱۹۴۷ عیسوی
بہ موقع محفل میلاد بہ خانہ خود

ہے کیسی روشنی اور کیوں تجلی زا ہے محفل — سراسر نور ہے اور مطلع انوار ہے محفل
خوشی ہے بارھویں کی اور عید میلاد ہے — گناہ گاروں کی سچ پوچھو تو یہ غمخوار ہے محفل
یہی وہ دن ہے جب آقا ہمارے آئے دنیا میں — عجب خوشبو ہے پھیلی کیسی عنبر بار ہے محفل
نبی جی کی خوشی پڑھ کر سناتی تھیں جو خوش ہو کر — انہیں کے گھر میں یہ برپا مسرت بار ہے محفل

عہ نبی جی کی خوشی میلاد شریف کی کتاب مصنفہ رح. بانو زوجہ نظامی۔

جو اس محفل کی بانی تھیں بہن تجو اکبر سب جا کر
انہیں کے دم قدم سے آج یہ گلزار ہے محفل

رہے اولاد خوش ان کی وہ جنت میں بہن فیروز ہیں
دعائیں مانگتی ہیں کہ یہ بھی خوش ہیں گفتا ہے محفل

ہوئے ہیں آج پیدا اپنے آقا اتنی خوش ہیں
نہ ہو جب تک خلوص ان میں یہ کب ہو پاتی ہے محفل

گئے تھے عرش اعلیٰ پہ وہی یاں آنے والے ہیں
بڑی قسمت ہے ان کی طالب دیدار ہے محفل

دعا ہے یہ نظامی کی رہے یہ حشر تک قائم
خلوص اور صدق ہے اس میں یہ خوش آثار ہے محفل

۱۳۲۵ھ

ظلمتِ شب مٹ گئی پھر نور کا تڑکا ہوا
کھل گئیں آنکھیں نبی خانہ کا در پیدا ہوا

پھر سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھیری گئی
ہر در و دیوار رشکِ دیدۂ بینا ہوا

چاندنی کا فرش ہے روشن نگاہوں میں کیا
چاندنی کا رنگ جس کے سامنے میلا ہوا

شامیانہ ہے کہ سر پر رحمتِ غفار ہے
دو یہ چشم زخم یا ہیں کا ہر اک ٹانکا ہوا

شامیانہ ہے کہ سر پر عالم انوار ہے
بارہا دیکھا ہے اس سے نور سا چھنتا ہوا

رونق افزا منبر پر نور ہے سمتِ جنوب
سامنے اس کے ہم نقشِ پائے شہ رکھا ہوا

جس کے ہم بندے ہیں اس کے پائے اقدس کا ہے نقش
ہے یہ نقشِ پا ہمارا قبلہ و کعبہ ہوا

کس طرف کرتا ہوں سجدہ ہے کہ یہ قبلہ مرا
ہے غضب جو کام میں اجیب سہو کا سجدہ ہوا

ابنیہ طاق آنکھیں سلیمہ محمد استلون
بزم خانہ پیکر عشاق کا نقشا ہوا

یہ مکاں وہ ہے کہ جس کی نسبت سے ہے اعلیٰ مرتبہ
ماشاء اللہ رتبہ اس کا کیا اعلیٰ ہوا

اس مکاں کو غرب کیوں کہیے نہ دعویٰ شرق کا
مثل مغرب شرق ہے اس کی شفق پھولا ہوا

واہ ہے کیا ساز و ساماں الحمد زر و فر زنہ
ہو ترقی اس کو دن دونی یہ ہے بڑھتا ہوا

لے ہی آیا شوق خاطر مدح خوانوں کو نصیب
آ گیا ہر اک ہوائے شوق میں اڑتا ہوا

ان میں تھا اختر بھی داخل لیجیے شوق دلی
درمیان نازِ نگاہِ شوق کا جادہ ہوا

مدح خوانی کی اجازت حضرت ذاکر نے دی
با ادب بیٹھا یوں ہر ممبرِ سخن پیرا ہوا

سلسلۂ ہذیان وحشت قلب پژمردہ ہوا
پھر بہار آئی جنونِ کہنہ پھر تازہ ہوا

دل لیے زخمِ جگر پر خیر مقدم آ گیا
پھر دلِ صد چاک شرحِ بانیِ شوم گویا ہوا

پھر دلا دی یاد اس مہتاب کی اس چاند نے
مشرقِ انوار جس سے نیرِ بطحا ہوا

کفر کی جس سے ہوئی کافور ظلمت گستری
تاجِ فرقِ فرقداں جس کا ہر اک ذرہ ہوا

مٹ گئیں جس کے سبب سے رسمِ آئینِ کفر
منتظم قانونِ قدرت جس سے دنیا کا ہوا

کر دیا دشمن کو جس نے دوستدار اک آن میں
نقشِ تسخیرِ دو عالم جس کا نقشِ پا ہوا

جس نے ادنیٰ سے اشارے میں قمر کو دو کر دیا
ہر گلہ جس سے حریفِ قیصر و کسریٰ ہوا

رب نے جس کو قومِ وحشی کا مربی کر دیا
زمرۂ اربابِ دانش جس کا وابستہ ہوا

تھا نہ جس کو خوفِ اعدا تھا نہ جو محتاجِ گنج
جس کو اک قوت خدائے پاک پر تکیہ ہوا

جس کے گھر بفضلِ خدا کا آستاں پہرا رہا
تھا حصارِ عافیت نامِ خدا جس کا ہوا

جس نے اِن لوگوں کو بہا دی تخت شوکت نمایاں
قطرہ قطرہ جس کے بحرِ فیض سے دریا ہوا

آج حاضر ہیں نظامی مطلعِ ثالث پڑھو
وصف میں ممدوح کے ہر لفظ ہو ڈوبا ہوا

پھر رہا تھا قافلہ مدت سے جو بھٹکا ہوا
رہنما اس کا تو ہی اے بنیہ والا ہوا

آج ہی کے روز مکہ میں ہوا تیرا ظہور
تھی یہی تاریخ تو مکہ میں جو پیدا ہوا

روشنی تیری عرب ہی تک نہ کچھ محدود تھی
نور تیرا ہر طرف عالم میں ہے پھیلا ہوا

خیر مقدم کیلئے توحید دوڑی ہو کے خوش
جلوہ گر دنیا میں جب تو اے کرم دیکھا ہوا

آئی کعبہ سے ندا اب قدرداں مجھکو ملا
جانشیں حضرت خلیل اللہ کا پیدا ہوا

بولا زمزم بھیجا خالق نے مری آنکھوں کا نور
چاہ میں اسکی تھا اندھا آج میں بینا ہوا

کہتے تھے آتشکدے ہیں ایک اوس سے عمر بڑی
آج کے دن دین ابراہیم کا زندہ ہوا

کہتے تھے بت آج اکھڑ جاتے ہیں اپنے قدم
کیسی ہلچل پڑ گئی دنیا میں جانیں کیا ہوا

مشرق انوار ہوں تھا شعب بو طالب کا قول
رونق افزا آج دنیا میں مرا پیدا ہوا

کہتا تھا کعبہ کہ کہنے کو تو میں یوں کعبہ تھا
حق یہ ہے میں آج کعبہ بن گیا قبلہ ہوا

میں ہوں رشک صد بدخشاں کہتا تھا یہ پتھر
کب کسی جا ایسا لعل بے بہا پیدا ہوا

دیکھ کر عادات تیرے کہتے تھے اہل قریش
فخر دنیا کے بڑے بوڑھوں کا یہ لڑکا ہوا

ہے نصیبہ کا مقدر اس کا قسمت اسکی ہے
کیوں نہ مل جائے خدائی اس کو تو جس کا ہوا

گیت گانے لگے کفر تری رحمت کے تیرے ہو گئے
عکس نور حق سے معکوس یہ قضیا ہوا

تیرے حسن خلق نے غیروں کو اپنا کر لیا
جو مخالف تھا وہ آخر والہ و شیدا ہوا

حضرت فاروق اعظم کا ہوا سر جان ڈال
دیکھئے شان خدا اک دم میں کیا کا کیا ہوا

کر سے ہو تجھ سا زمانے میں کہاں کس نے سنا
ہاں زمانہ سارا تجھ سے خلق البتہ ہوا

اک ذرا جس دم تری نیچی نظر اونچی ہوئی
اک تلاطم اٹھ گیا اونچو کا سر نیچا ہوا

ماہ رخشاں ہے تو ہی اے جانِ عبداللہ کے
تیرا ہر عضوِ مبارک چاند کا ٹکڑا ہوا

نعت تیری اے نبی کیونکر یہ بندا لکھ سکے
خالقِ ارض و سما مداح خود تیرا ہوا

اس لئے اب میں دعا پر ختم کرتا ہوں کلام
ہو گی وہ مقبول جب تو واسطہ اپنا ہوا

حاضرینِ محفل سبھی گھر کو اپنے جائیں شاد کام
کام سب بن جائے جو کچھ انکا ہو بگڑا ہوا

چار سو نازل وبا کی ہے مصیبت آجکل
یا الٰہی امن ہی ہو ماموں یاں آیا ہوا

بانیٔ محفل کو یارب عمر نوحی ہو عطا
یہ انہی کے دم قدم سے خیر کا جلسہ ہوا

عزتِ دارین حاصل ہو نظامی کو مدام
کوکبِ طالع رہے اس کا یونہی چمکا ہوا

کہتے ہیں اہل سخن سنکر نظامی کا کلام
غالبِ مغفور کا رنگِ سخن پیدا ہوا

قوم کی فریاد

جو اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ء میں لکھی گئی اور صد سالہ حالی جوبلی کے جشن کے موقع پر پیش کی گئی

ذلت میں مسلماں ہیں پھنسے حال برا ہے
زردار ہے آرام سے ان میں نہ گدا ہے
ہر سمت یہی غل ہے یہی شور بپا ہے
اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

وہ گل جو مہکتا ہوا نکلا تھا چمن سے
اک دیس میں اس پر ہے پڑی چرخ کہن سے
بے قدر ہے وہ لعل جو آیا تھا یمن سے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جس دین نے تھا خوانِ کرم عام بچھایا　　جو دین تھا دنیا کیلئے نعمتِ عظمیٰ
جو دین تھا تہذیب و تمدن کا نمونہ　　جس دین کے مداح تھے کبھی قیصر و کسریٰ
خود آج وہ مہمانِ سرائے نفرا ہے

وہ دین مبین جس نے دکھائی رہِ عرفاں　　وہ دین کہ جس نے ہمیں دی مشعلِ قرآں
جو کفر کی ظلمت میں بنا ماہِ درخشاں　　وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

وہ دین جو تھا حامیٔ ہر صنف ایماں　　وہ دین ہوا کفر سے جو دست و گریباں
وہ دین کہ جو سینہ سپر تھا ہر میداں　　جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اُس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے

آیا تھا جو دین امن کے سکے کو جمانے　　لاتفسدوا فی الارض کی تعمیل کرانے
سب کو سبقِ سورۂ اخلاص پڑھانے　　جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اُس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے

جس دین نے اسلوبِ اخوت کی سکھائے　　جس دین نے اسبابِ عداوت کے مٹائے
جس دین نے انداز محبت کے بتائے　　جس دین نے تھے غیروں کے دل آ کے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

جس دین میں یکرنگی کا مخصوص اثر تھا　　جس دین کہ دوئی شرک تھی شرک سے حذر تھا
وہ دین کہ اخلاص و مروت کا جگر تھا　　جو دین کہ ہمدردیٔ نوعِ بشر تھا

اب جنگ جدل چار طرف اس میں بپا ہے

رشکِ جم و فغفور ہوئے جس کے گدا بھی — خدمت میں رہے جس کی امیر الامرا بھی
جس دین میں ہو چھوٹے سے اچھا تھا بڑا بھی — جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی

اس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے

وہ دین جو تعلیم میں تھا اہل ہدیٰ کی — حاصل تھی جسے تربیت ارباب صفا کی
وہ دین جو آنکھوں میں رہا تھا عرفا کی — جو دین کہ گودوں میں پلا تھا حکما کی

وہ عرصۂ تیغ جہلا و سفہا ہے

جس دین کو اغیار بھی سب رکھتے تھے محبوب — جس دین سے ہر فرقۂ باطل ہوا محجوب
او یار خدا کیسی یہ حالت ہوئی مقلوب — جس دین کی حجت سے سب ادیان تھے مغلوب

اب معترض اس دین پہ ہر ہرزہ درا ہے

ہے حفظ خدا دین نبی کے لئے کافی — ہر علت حادث سے شفا بخش ہے شافی
حامی ہو خدا جس کا ہو کون اس کا منافی — ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی

دینداروں میں پر آب ہے باقی نہ صفا ہے

افسوس کہ اس وقت یہ حالت ہے ہماری — مسدود نظر آتی ہے ہر راہ ترقی
اس حال میں تدبیر کوئی بن نہیں آتی — عالم ہے سو بے عقل ہے جاہل ہے سو وحشی

منعم ہے سو مغرور ہے مفلس سو گدا ہے

یاں فتنہ ہے دن رات اور جنگ شدید و تند — یاں جہد و جہد دن رات وہاں بنگہ شب و روز

یاں رقص ہے دن رات تو ہاں جنگ شب و روز — یاں راگ ہے دن رات تو واں رنگ شب و روز
یہ مجلس اعیاں ہے وہ بزم شرفا ہے

خود رائی ہے چھوٹوں میں تو غفلت ہے بڑوں میں — چھوٹوں میں ادب ہے نہ لیاقت ہے بڑوں میں
کچھ عزم ہے چھوٹوں میں نہ ہمت ہے بڑوں میں — چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں
پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے

اب دیکھئے جس شخص کو وہ خاک بسر ہے — جو شخص ہے بانسے ہوئے ذلت پہ کمر ہے
کچھ علم سے بہرہ ہے نہ صنعت کی خبر ہے — دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے
اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے

ہے دین کی دولت سے ضیا علم سے رونق — دولت سے ہے نشو و نما علم سے رونق
قوت رہی دولت سے سدا علم سے رونق — ہے دین کی دولت سے بہار علم سے رونق
بے دولت و علم اس میں نہ رونق نہ بہا ہے

بے زر نہیں اسباب ترقی کے میسر — بے علم کے تدبیر نہیں سوجھتی بہتر
سچ حضرتِ حالی کا ہے یہ قول سراسر — شاہد ہے اگر دین تو علم اس کا ہے زیور
زیور ہے اگر علم تو مال اس کی جلا ہے

ہے علم سے توقیر تو دولت سے ہے حشمت — ہر قوم کی ہے علم سے اور مال سے عزت
تھی حکمت و دولت ہی سے اسلام کی عزت — جس قوم میں اور دین میں ہے علم نہ دولت
اس قوم کی اور دین کی پانی پہ بنا ہے

کی دولت و اقبال نے جب ہم سے جدائی — وسعت ہے ارادوں میں نہ طالع میں رسائی
اے صاحبِ معراج دہائی ہے دہائی — گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

تو حامد و محمود ہے تو مہدی و ناصر — یہ نام ہی بچائے ہم اس پر ہیں شاکر
منسوب ترے نام سے ہے قوم بہ ظاہر — ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

وہ سرو جو آزاد تھا با حشمت و اجلال — سبزے کی طرح آج نظر آتا ہے پامال
اس دور میں وہ حال تھا اس کا نہ یہ حال — جس قصر کا تھا سر بہ فلک گنبدِ اقبال
ادبار کی اب گونج رہی اس میں صدا ہے

وہ پھولا پھلا عیش فزا دین کا گلزار — تھا جس کو کبھی بادِ خزاں سے نہ سروکار
اب فصلِ بہار آتے ہوئے اس میں ہے بیزار — بستر تھا نہ جو بادِ مخالف سے خبردار
جو چلتی ہے اب حق میں خلاف اس کے ہوا ہے

یوں دیکھے آثار ہے یہ گردشِ ایام — وہ رات نہ وہ دن ہے نہ وہ صبح نہ وہ شام
فریاد ہے فریاد زمانہ ہی ہے گمراہ — وہ روشنیِ بام و درِ کشورِ اسلام
یاد آج تلک جس کی زمانہ کو ضیا ہے

روشن نظر آتا ہے کہاں اب کوئی چراغ آج — ملتا ہی نہیں پھر نشاں کوئی چراغ آج
پاتا نہیں بس بزم میں یاں کوئی چراغ آج — روشن نظر آتا نہیں یاں کوئی چراغ آج
بجھنے کو ہے اب گر کوئی بجھنے سے بچا ہے

جس قوم کے دل نیک ارادوں سے تھے مملو — جو قوم کہ حکمت میں ہوئی رشک ارسطو
اُس قوم کا یوں کھینچا ہے اس شعر میں فوٹو — عشرت کدے آباد تھے جس قوم کے ہر سو

اس قوم کا اک ایک گھر اب بزم عزا ہے

ہر علم میں تھی مشق مہارت ہنروں میں — عزت تھی عزیزوں میں ثریا اثروں میں
ہر وقت ترقی ہی کے چرچے تھے گھروں میں — چاؤش تھے للکارتے جن رہگزروں میں

دن رات بلند اُن میں فقیروں کی صدا ہے

وہ مشعل دیں جس میں ترقی کی جھلک تھی — مذہب کی ضیا اور اخوت کی مہک تھی
جس قوم کی شہرت زسماں تا بہ سمک تھی — وہ قوم کہ آفاق میں جو سر بہ فلک تھی

وہ یاد میں اسلاف کی اب روبہ قضا ہے

وہ قوم جو محسود تھی اسکندر و جم کی — وہ قوم جو مخزن تھی کمالات اُمم کی
وہ قوم جو تھی اہل کبھی سیف و قلم کی — جو قوم کہ مالک تھی علوم اور حکم کی

اب علم کا واں نام نہ حکمت کا پتہ ہے

دنیا میں کسی قوم کا تھا اوج کب اتنا — کرتے تھے کسی قوم کا کب لوگ ادب اتنا
موجودہ زمانہ میں سمجھتے ہیں سب اتنا — کھوج ان کمالات کا لگتا ہے اب اتنا

گم دشت میں اک قافلہ بے طبل و درا ہے

اب حالت دل تم سے چھپائے نہیں بنتی — کیا ضبط ہو بے شور مچائے نہیں بنتی
وہ بوجھ پڑا ہے کہ اٹھائے نہیں بنتی — بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہیں بنتی

ہے اس سے یہ ظاہر کہ یہی حکم خدا ہے

طالب تھے دوا کے تو طبیبوں کو دعا کے | پاتوں جزا آئی تھی نہ منکر تھے سزا کے
تھے زیست کے ممنون تو قائل تھے قضا کے | تھی آس تو تھا خوف بھی ہمراہ رجا کے

اب خوف ہے ہمت کو دلوں میں نہ رجا ہے

یہ رنج و تعب اپنے ہی ہاتھوں کی ہیں کرتوت | یہ شور و شغب اپنے ہی ہاتھوں کی ہیں کرتوت
یہ آلش و تعب اپنے ہی ہاتھوں کی ہیں کرتوت | جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کی ہیں کرتوت

شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلا ہے

یہ شامتِ اعمال یہ ذلت یہ نحوست | یہ غفلتیں یہ بے حسی و پستی ہمت
ہے عیش پرستی نے دکھائی یہ مصیبت | دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت

سچ ہے کہ برے کام کا انجام برا ہے

ہے سب سے جدا آج روش پیر و جواں کی | ہے حفظ کا اندیشہ نہ دہشت ہے زیاں کی
کس وقت ہیں ہم لوگوں کو سوجھی ہے کہاں کی | کی زیب بدن سب نے ہے پوشاک کتاں کی

اور برف میں ڈوبی ہوئی کشور کی ہوا ہے

مخلوق ہیں یہ نام کو کہلاتے ہیں انساں | ہیں ان کے خیالات خیالاتِ پریشاں
کیا جانیں یہ کس درد کا ہے کونسا درماں | درکار ہے یاں معرکے میں جوشن و خفتاں

اور دوش پہ یاروں کے وہی کہنہ ردا ہے

غفلت کی کوئی حد بھی ہے کس درجہ یہ غافل | گویا انہیں ادراک کی قوت نہیں حاصل
یہ کوتاہ نگاہی بھی ہے افسوس کے قابل | دریائے پر آشوب ہے اک راہ میں حائل

اور بیٹھ کے گھڑنائی پہ یاں قصدِ شنا ہے

نہ یاں دکانیں مفت ہیں نہ مکان مفت — ضائع کئے دیتے ہیں یہ کمبخت جان مفت
جاتے ہیں ہلاکت کی طرف پیر و جوان مفت — ملتی نہیں اک بوند بھی پانی کی جہاں مفت

وان قافلہ سب گھر سے تہی دست چلا ہے

ہیں کہنہ خیالات یہ سب پہلے زمانے — سنتے ہی نہیں کان کہ وہ تازہ فسانے
یہ دیکھ کے سمجھے ہیں انھیں کون نہ جانے — یاں نکلے ہیں سودے کو درم لیکے پرانے

اور سکہ رواں شہر میں مدت سے نیا ہے

اب جوشش امواج کو خاطر ہے پریشاں — ہے اتنا تلاطم کہ نجات اب نہیں آساں
سیلاب سا سیلاب ہے طوفاں سا ہے طوفاں — فریاد ہے اے کشتیٔ امت کے نگہباں

بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

خود اپنے لئے ہو گئے ہم وجہ خرابی — اب ہم سے کسی طرح یہ بگڑی نہیں بنتی
اسلام کے گلزار پہ چھائی ہے اداسی — اک چشمۂ رحمت بانیٔ امت امی

دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے

ہر چند کہ اعدا نے بلا وجہ ستایا — حاسد کو تیرے پہ بھی کچھ رحم نہ آیا
اس حال سے واقف ہے ہر اک اپنا پرایا — جس قوم نے گھر بار وطن تجھ سے چھڑایا

جب تو نے کیا نیک سلوک ان سے کیا ہے

قاتل جو ترے عم کا ترے سامنے آیا — حاصل یہ ہے کہ اس سے نہ لیا خون کا بدلا
ہو کس سے بیاں عفو و کرم کا ترے شایاں — صدمہ زد دنداں کو ترے جس سے کہ پہنچا

کی ان کے لئے تو نے بھلائی کی دعا ہے

تو فخرِ ہاشمیہ بھی ہے تو فخرِ عرب بھی ۔ تو ختمِ رسالت ہے بڑی شان ہے تیری
تمثیل ترے لطف و کرم کی نہیں ملتی ۔ کی تو نے خطا عفو ہزاران کینہ کشوں کی
کھانے میں جنھوں نے کہ تجھے زہر دیا ہے

دیکھا جو ترے صبر کا غصہ پہ تقدم ۔ اعدا کے بھی ہوش و خرد و عقل ہوئے گم
ظالم بھی ہوئے دست کشِ جور و تظلم ۔ سو بار ترا دیکھ کے عفو اور ترحم
ہر باغی و ہر سرکش کا سر آخر کو جھکا ہے

جو ہجو کیا کرتے تھے بازار میں تیری ۔ گستاخیاں جو کرتے تھے سرکار میں تیری
یا گوئیاں جو کرتے تھے اذکار میں تیری ۔ جو بے ادبی کرتے تھے اشعار میں تیری
ہر دل انھیں سے تری پھر مدح و ثنا ہے

جو کافر و مشرک تھے ترے خون کے پیاسے ۔ محروم پھرے وہ بھی نہ دربار سے تیرے
جب غیر بھی تجھ سے متمنی ہوں کرم کے ۔ بندہ ہو ترے جبکہ یہ اعدا سے ہوں اپنے
انعام اسے غلاموں کو کچھ اس سے سوا ہے

کر حق سے دعا امتِ معصوم کے حق میں ۔ کر حق سے دعا امتِ مظلوم کے حق میں
کر حق سے دعا امتِ مغموم کے حق میں ۔ کر حق سے دعا امتِ مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے

امت میں تری پیر ہو یا ہو کوئی کمسن ۔ کچھ تنگ نہیں ان سب کا تو ہے حامی و ضامن
ہو فکر نہ ان کی تجھے کس طرح ہے ممکن ۔ امت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن

دلدادہ ترا ایک زمانے میں ہوا ہے

ہم جیتے ہیں شاہا تری بخشش کے سہارے | ہے اپنی دعا جان ترے نام پہ نکلے

نہ بندوں سے خدا ہم کو مسلمان اٹھائے | ایماں جسے کہتے ہیں عقبیٰ میں ہمارے

وہ تیری محبت تری عترت کی ولا ہے

ہے تجھ سے سروکار ہمیں غیر سے کیا کام | ہیں جانتے تجھ کو سبب دفع صد آلام

رٹتے ہیں ترا اسم مبارک سحر و شام | ہر حلقۂ لیس ہر محالف میں ترا نام

ہتھیار جو اپنوں کا ہے پیروں کا عصا ہے

آنکھوں میں یہودی کی جو اکسیر ہوئی تھی | تھی آپ کی نعلین مبارک کی وہ مٹی

کچھ شک نہیں اس بات میں یہ بات ہے سچی | جو خاک ترے در پہ ہے جاروب سے اڑتی

وہ خاک ہمارے لئے دارو ئے شفا ہے

جو شہر ہوا تیری حمایت سے مشرف | جو شہر ہوا تیری حکومت سے مشرف

جو شہر ہوا تیری نبوت سے مشرف | جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف

اب تک وہی قبلہ تری امت کا رہا ہے

جس خطۂ عالی میں بنی آپ کی تربت | رونق میں وہ ہے رشک دہ گلشن جنت

جس شہر کی کرتے ہیں ملک آکے زیارت | جس ملک نے پائی تری ہجرت سے سعادت

کعبے سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہے

ہر سمت سے نرغہ ہے غم و رنج و الم کا | غیروں کا تو کیا ذکر خود آپس میں ہے جھگڑا

کل دیکھئے پیش آئے غلاموں کو ترے کیا — اپنوں میں بھی کوئی نظر آتا نہیں اپنا

اب تک تو ترے نام پہ اک ایک فدا ہے

حق نے جو شفاعت کا تجھے مرتبہ بخشا — عاصی ہیں مگر ذات پہ تیری ہے بھروسا

بخشش کا غلاموں کی لیا تو نے جو ذمہ — گر بد ہیں تو حق اپنا ہے کچھ تجھ پہ زیادہ

اخبار میں الطاف کی ہم نے سنا ہے

کچھ غم نہیں دشمن جو زیادہ ہیں ہمارے — جیتے ہیں تمہاری ہی حمایت کے سہارے

تم ہو نہ پکارے تو کوئی کس کو پکارے — ہم بیکس ہیں بے بس ہیں پھر آخر ہیں تمہارے

نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے

ہر قوم کے ہمدردوں کو بس فکر اسی کی — اس قوم کی دنیا میں ہو پہلی سی ترقی

تقدیر کی گردش سے مگر کچھ نہیں چلتی — تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی

ہاں ایک دعا تیری کہ مقبول خدا ہے

دنیا کی نمائش کا نہیں چاہئے ساماں — خواہش ہے تو ہم کسی شے کے نہیں جویاں

ہر دل کی یہ خواہش کہ رہیں شاد مسلماں — خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں

پر فکر ترے دین کی عزت کی سدا ہے

بس دل پہ شب و روز یہی رنج ہے طاری — لے ڈوبے جماعت کو نہ افراد کی خواری

اس دین مبارک کے لئے فکر ہے ساری — گر دین کو جوکھوں نہیں ذلت سہی ہماری

امت تری ہر حال میں راضی بہ رضا ہے

ثروت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں — حشمت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں

شوکت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں — عزت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں

اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلت میں مزا ہے

مخالف ہے نظامی غضبِ شاہِ عرب سے — آداب پیمبر کا سوا چاہیے سب سے

اس واسطے الفاظ نکلتے ہیں یہ لب سے — ہاں حالی گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے

باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہے

کہنا تھا جو کچھ تجھ کو کہا تو نے مگر اب — جس کام کا ہو اہل وہی کام ہے انسب

وہ بات نہیں جس کا ہو انسان کو منصب — ہے یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہے کون مخاطب

یاں جنبشِ لب خارج از آہنگ خطا ہے

متفرق نظموں کا مجموعہ

ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء

ایک پکٹنگ کمیٹی والی خاتونوں کو دیکھ کر

ساقی گری جو کرتی تھیں ہر بزم ناز میں
عہدہ ملا ہے آج انہیں احتساب کا

جنہیں بنات عیش سمجھتے تھے قوم نے
کہنے کو یوں تو ہے ابھی عالم شباب کا

جوش سیاسیات سے دنیا بدل گئی
حائل نہیں ہے بام کو پردہ نقاب کا

گھونگٹ تو کھل گیا ہے مگر شرم ہے ابھی
کچھ کچھ اثر ہے آنکھوں میں اب بھی حجاب کا

نیچی نظر کئے ہوئے مردوں سے ہے خطاب
باتیں ہیں لطف کی نہیں پہلو عتاب کا

سمجھاتی ہیں کہ ملک میں افلاس کا ہے زور
ایسے میں کیا مزا ہے شراب و کباب کا

پیش نظر ہے ہند کی بہبود کا خیال
ہاں کچھ نہیں خیال عذاب و ثواب کا

یہ کہہ رہی ہیں خون ہمارا بہایئے
یا توڑ دیجئے خم و مینا شراب کا

اس پر بھی گر خیال نہ ہو آپ کو تو پھر
قسمت ہے ملک کی نہیں شکوہ جناب کا

کاشتکاروں سے خطاب

مطبوعہ زمیندار کسان ۲۰ مئی سنہ ۳۲ء

اے کاشتکار دل میں کچھ غور کر خدارا
اس کشمکش میں ہوگا کیونکر ترا گذارا

یا تو ترے ہی بل بوتے پر علمی تھی ساری دنیا
یا تو ہی ڈھونڈتا ہے اب اور کا سہارا

سب آگے بڑھ رہے ہیں تو پیچھے ہٹ رہا ہے
ہاں اب ذرا سنبھل جا نزدیک آگیا کنارا

عزت سے گر ہے رہنا قرضہ سے دور بھاگو
یہ سوچ لو ابھی میں ہے اب بھلا تمہارا

محنت بھی ہو تمہاری لاگت بھی ہو تمہاری
دولت کا دوسروں کی ہرگز نہ ہو سہارا

محنت ہو جو کماؤ خود اس کا لطف اٹھاؤ
ساجھی نہ ہو مہاجن اس نفع میں تمہارا

اس بات پر اگر تم دل سے عمل کروگے
چمکے گا اک نہ اک دن تقدیر کا ستارا

غریب کسانوں کی فریاد عیش پرست زمینداروں سے

۲۰ جولائی ۱۹۳۲ء

کیوں عیش کے متوالو یہ بھی کبھی سوچا ہے
کیا رنگ ہے دنیا کا کس رنگ میں دنیا ہے

کیا مالک کی حالت ہے کیا حال گھروں کا ہے
کیا کھاتے ہیں دیہاتی کیا ان کا سہارا ہے

کس طرح وہ جیتے ہیں کس حال میں رہتے ہیں
کچھ چین بھی ملتا ہے یا رنج ہی سہتے ہیں

کس کام کی سرداری کس کام کا یہ ٹھاٹھ
رحم ان کی تباہی پر جب تم کو نہیں آتا!

ہمدرد جو ہو ان کا وہ پاس نہیں پاتا
مرزوق ہے تو دنیا میں لالہ کا بھی کھاتا

قرضہ سے زمانے لے کر جو دام کماتے ہیں
کچھ اصل میں جاتے ہیں کچھ سود میں جاتے ہیں

افسوس کہ محنت بھی آتی نہیں کام اُن کے
لالہ کے مقابے میں لکھ جاتے ہیں نام ان کے

مزدور غریب عاجز دنیا میں ہیں نام ان کے
مجہول ذلیل احمق یہ عرف ہیں عام ان کے

لڑکے ہیں تو بڑھنے کی تدبیر نہیں ہوتی
لڑکی ہے تو کچھ اس کی توقیر نہیں ہوتی

مدفون خزانوں سے ہو کام تجارت کا
یورپ کی طرح سیکھیں تکمیل زراعت کا

انجن ہوں مشینیں ہوں چرچا ہو ریاضت کا
ہر گھر میں دما دم ہو انساں کی راحت کا

سب کارکن اپنے ہوں فرما اپنے ہوں دام اپنے
سرمایۂ قومی سے چلتے رہیں کام اپنے

نظم خیر مقدم صدر پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اجلاس نہم بریلی

۲۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء

سبب کیا ہے بریلی میں ہے کیوں یہ محفل آرائی
کہ جس کو دیکھ کر حیرت زدہ ہے سب تماشائی

مسلمانوں کی پژمردہ طبیعت کیوں ہے گلگوں
چمن جو لٹ گیا تھا آج پھر اس میں بہار آئی

جو حضرت با لیاقت ہیں مجسم قابلیت ہیں
انھیں کے دم قدم سے ہے یہ ساری بزم آرائی

یہ ہیں نواب والا منزلت عالی مراتب ہیں[عہ]
امانت کے سوا ان کو ملی ہے عقل و دانائی

انھیں غم ہے مٹے اس ملک کی کس طرح بیکاری
کمیٹی یونس کی بھی اسی مقصد سے بنوائی

جو فرمائی صدارت آپ نے اس بزم علمی کی
حقیقت میں ساری قوم کی ہے عزت افزائی

عہ نواب لیاقت علی خاں مرحوم۔

یقین عین الیقین ہے آپ کے حسنِ تدبر سے
مٹے گا چہرۂ قومی سے اک دن داغ رسوائی

دعا یہ ہے خدایا ہم کو وہ عزمِ مستقل بخشے
نہ چھٹنے پائے ہم سے دامنِ صبر و شکیبائی

جمود و مردنی جاتی رہے سب قومِ مسلم سے
عطا ہو عزم و ہمت از سرِ نو ہو توانائی

ایک زمیندار کی زبان سے

۲۰ ستمبر ۱۹۳۳ء

ہے باقی نقش دھندلا سا اب تصویر کے بدلے
نہیں اب آتی ہے تدبیر کچھ تقدیر کے بدلے

ملمع کے نام کو بٹہ لگا یا سکے بدلے ہیں
گلے کا ہار ہے بے عزتی توقیر کے بدلے

جنھوں نے آج دنیا میں ہوا کا رخ نہ پہچانا
ملا ہے بھیک کا ٹھکرا انھیں جاگیر کے بدلے

ہمیں ڈھلنا نہیں آتا ہے سانچے میں زمانے کے
ہیں سب ادبار ہم پر بس اسی تقصیر کے بدلے

نہیں ہے بندۂ بے زر نہیں یارا ہے جنبش کا
کہ بیڑی قرض کی پیروں میں ہے زنجیر کے بدلے

نہیں ہے سوکھی روٹی بھی میسر دودھ بھی کیسا
لہو کے گھونٹ پینے کیلئے ہیں شیر کے بدلے

بنا ہیں کیا مکاں جھونپڑا بھی تو اب بن نہیں سکتا
نہیں ہے مقدرت بانسوں کی بھی شہتیر کے بدلے

مسلم یونیورسٹی اسکول کے طلباء کی جانب سے نواب خان بہادر سر مزمل اللہ خاں صاحب کی آمد پر لکھی گئی

۱۹ اکتوبر ۱۹۳۳ء

تجھے حق نے دیا ہیں تو نے دیا — تجھے کہتی ہے دنیا مجسم عطا
تری داد و دہش تیرا ذوقِ سخا — سارے ہندوستان پر ہے چھایا

مرے اچھے نواب مرے حاتم نواب
رہو تم کامیاب رہو تم کامیاب

جہاں ابرِ کرم ہے نہ برسا ترا — نہ نکلے گا ایسا کوئی مدرسہ
ہے سب اس کا بڑھتا ترا مدعا — کوئی فرقہ کرم سے نہ تیرے بچا

مرے اچھے نواب مرے حاتم نواب
رہو تم کامیاب رہو تم کامیاب

تو جہاں سے بھلا تو جہاں کا بھلا — تو ہے سب سے سخی تری سب پر دیا
تجھے کہتے ہیں سب رہنما پیشوا — تجھے بخشا خدا نے بڑا مرتبہ

مرے اچھے نواب مرے حاتم نواب
رہو تم کامیاب رہو تم کامیاب

بے روزگاروں کی فریاد

۵ر مارچ سنہ ۳۴ء

غضب ہے زیست سے لکھے پڑھے بیزار بیٹھے ہیں
گزر اوقات کی صورت نہیں بیکار بیٹھے ہیں

کیا ہے خرچ اور زحمت اٹھائی امتحانوں کی
نتیجہ یہ ہوا اس کا کہ اب ناچار بیٹھے ہیں

سفارش بھی کرائی عرضیاں بھی ہر جگہ بھیجیں
مگر ناکام ہو کر اب تو ہمت ہار بیٹھے ہیں

خدا کا قہر ٹوٹا ان نئی تعلیم والوں پر
ہر اک گھر میں معطل ایک کیا دو چار بیٹھے ہیں

کسی دفتر میں آسامی کوئی گر ہو گئی خالی
ہزاروں اس لئے عرضی لیے تیار بیٹھے ہیں

ہوئے ہیں بی اے اور ایم اے پریشاں آجکل ایسے
کہ جوتوں پر وہ پالش کرنے کو تیار بیٹھے ہیں

سنائیں درد یہ کس کو کہیں یہ داستاں کس سے
کہ اپنی جان سے بیزار ہم سرکار بیٹھے ہیں

دہقان

۲۰ر ستمبر ۱۹۳۴ء

وطن میں بھی نہیں تجھ کو میسر عیش کا ساماں
ہر اک سن کر تری حالت کو رو دیتا ہے اے دہقاں

کبھی سوچا بھی تو نے کیوں نہیں تن پر ترے کپڑا
کبھی سوچا بھی ہے کیوں کار ذلت نے تجھے جکڑا

کبھی سوچا بھی تو نے کیوں ترا گھر بار گرتا ہے
کبھی دل میں ترے آیا بھی کاروبار مندا ہے

کبھی سوچا بھی تو نے کیوں ترے حالات ابتر ہیں
کبھی دل میں ترے آیا بھی کیوں سب تجھ سے بہتر ہیں

قیامت خیز منظر میری آنکھوں میں پھرتا ہے — گلے پر مدعی کا خنجر تیز جس وقت چلتا ہے
سنبھل جا وقت ہے دہقاں ابھی تیرے سنبھلنے کا — جو طوفان آنیوالا ہے نہیں تمہارے ٹلنے کا
دگر نہ یاد رکھ آخر کو ایسا وقت آئے گا
کوئی ڈھونڈیگا تیرا بھی نام و نشاں تیرا نہ پائیگا

ووٹروں کی ذہنیت کا نوحہ

۱۴؍فروری ۱۹۳۷ء

ایک صاحب جو الکشن میں کھڑے تھے بدنصیب — کچھ خبر ہے ووٹروں نے کیا جواب ان کو دیا
ایک بولا آپ تھے میرے مخالف کے وکیل — آپ کو میں ووٹ کیوں دوں سوچئے دل میں ذرا
دوسرا بولا کہ جب کی تھی وکالت آپ نے — مجھ سے پورا محنتانہ ضابطہ کا لے لیا
آپ کے کہنے سے اب کیوں ووٹ دیدوں آپ کو — لے لئے جب دام مجھ سے آپ کا احسان کیا
تیسرا بولا کہ دی مجھ پر گواہی آپ نے — آپ کو میں ووٹ دوں ایسا نہیں ہوں بادلا
بولا یہ چوتھا لڑی تھی ممبری چنگی کی جب — آپ کس کے ساتھ تھے فرمائیے بہر خدا
آپ ہی نے میرے بھائی کی ہرائی ممبری — آپ ہی اب ووٹ مجھ سے مانگتے ہیں مرحبا
پانچویں سے ووٹ جب مانگا تو وہ بولا کہ خوب — ووٹ کیوں دوں آپکو حق آپکا مجھ پر ہے کیا
جب ملی تھی فوجداری کی حکومت آپکو — آپنے ناحق مرے نوکر کو دی تھی سزا
جب چھٹے ووٹر سے جاکر ووٹ کی درخواست کی — دیکھ کر ان کی طرف اس نے خفا ہوکر کہا

میں نے جب چاہی سفارش اپنے لڑکے کے لیے
آپ سے کیا ہو سکا یا آپ نے کیا کر دیا

غور خود فرمایئے خود اپنے دل میں سوچئے
کیا اعانت آپ نے کی چھوٹے وعدوں کے سوا

ایک ووٹر نے دیا یہ ووٹ کرتے وقت جواب
آپ سے مجھ کو نہیں کوئی شکایت یا گلا

باوجود اس کے مگر یہ بات مجھ پر شاق ہے
آپ آگے بڑھ گئے ہیں دیکھتا ہی رہ گیا

آپ تو ممبر بنیں ہیں آپ کا ووٹر بنوں
یہ ترقی آپ کی کیونکر گوارا ہو بھلا

خود تو ذلت میں رہوں عزت لگاؤں آپ کو
اپنا دشمن خود بنوں مجھ سے نہ ہوگی یہ خطا

الغرض ہر شخص کو اپنی غرض سے کام ہے
کس سے یہ کہیئے کہ سوچے قوم کا اچھا برا

دس بنیادی حقوق

۱۹۳۸ء

ہر حکومت پہ حق رعایا کا
اس سے انکار ہو نہیں سکتا

ہوئی دنیا میں جب سے آبادی
ساتھ آئے حقوق بنیادی

پھر تمدن کا دور جب آیا
اُن میں اک زور ہو گیا پیدا

جیوں جیوں تہذیب بڑھتی جاتی تھی
ہر طرف سے صدا یہ آتی تھی

سلطنت شخصیت کی رخصت ہو
یعنی جمہور کی حکومت ہو

ہوں مُسلّم اصول آزادی
ملیں سب کو حقوق بنیادی

یہ بہی حق ہیں دس ہی جن کا شمار — اُن کی تفصیل کچھ نہیں دشوار
حق جو ہے ان حقوق میں پہلا — (۱) مسئلہ ہے یہ روٹی کپڑے کا
ہے حکومت کا فرض یہ سمجھے — نہ رہیں لوگ بھوکے اور ننگے
بعدہٗ ملک کی حفاظت ہے — (۲) یہ نہیں ہو تو کیا حکومت ہو
تیسرے حق کا ہو یہ مطلب صاف — (۳) رو رعایت سے پاک ہو انصاف
رہیں بے لوث عدالت گستر — نسل اور رنگ کا نہ لیں وہ اثر
چوتھے نمبر پہ ہو یہ حق طلبی — (۴) عام آزادیاں ہوں سب کی
بعد ازاں ہو یہ پانچواں نمبر — (۵) رہے قائم زبان اور کلچر
پھر ہے تحصیل علم کی منزل — (۶) نہ رہے ایک فرد بھی جاہل
ساتواں حق ہو خدمت سرکار — (۷) جس پہ لوگوں کی قوت کا ہو مدار
سب کے شہری حقوق ہوں یکساں — (۸) ہر حکومت کے ہو یہی شایاں
ملکیت کے حقوق ہوں آزاد — (۹) ہو نہ ضبطی نہ جبر و استبداد
دسواں حق وہ ہو جو کہ آخر ہو — خود اہمیت اُس کی ظاہر ہو
ہے وہ دیگر حقوق کی کنجی — اس کے ملنے سے بنتی ہے بگڑی
حکمرانی میں سب کا ہو حصہ — (۱۰) یعنی جمہوریت کا ہو نقشہ
ہو یہی روح بس سیاست کی — اب یہی طرز ہو حکومت کی
اسی موضوع پہ لکھی ہو یہ کتاب — نظم ہے یہ اسی کا لُبِ لباب
یہ کتاب اور اس کی ہر تنقید — مصنف کے پالیٹکس کی ہو کلید

روشن مستقبل

یہ نظم مولانا ظفیل احمد صاحب منگلوری کی کتاب روشن مستقبل کیلئے لکھی گئی تھی جو اس کتاب میں درج ہے۔

لو وہ گہن سے نکلا سورج ‏ ‏ برج محن سے نکلا سورج
روشن اپنا مستقبل ہے

لال بھبو کا اس کی کرنیں ‏ ‏ کیسی پیاری پیاری کرنیں
روشن اپنا مستقبل ہے

تاریکی کا اب نام نہیں ‏ ‏ مایوسی کا کچھ کام نہیں
روشن اپنا مستقبل ہے

سوئی ہوئی سب خلقت جاگی ‏ ‏ ہندوستاں کی قسمت جاگی
روشن اپنا مستقبل ہے

اہلِ وطن کا شکوہ کیوں ہو ‏ ‏ مقصد ایک ہی جھگڑا کیوں ہو
روشن اپنا مستقبل ہے

مسلم کی ذہنیت بدلی ‏ ‏ ہندوستاں کی حالت بدلی
روشن اپنا مستقبل ہے

مسلم میں ہے قوم پرستی ‏ ‏ حُبِّ ملک سیاست اس کی
روشن اپنا مستقبل ہے

ناؤ قریب ساحل آئی آزادی کی منزل آئی
روشن اپنا مستقبل ہے
حق جو ہمارے ہیں بنیادی اُن کا ملنا ہے آزادی
روشن اپنا مستقبل ہے
صوبوں پر ہے اپنی حکومت مرکز[۱] پہ باقی ہے حجّت
روشن اپنا مستقبل ہے
رفتہ رفتہ مل جائیں گے آج نہیں تو کل پائیں گے
روشن اپنا مستقبل ہے
زر کی بارش ملک پہ ہوگی پھولے پھلے گی سب کی کھیتی
روشن اپنا مستقبل ہے
اوسر بنجر اور آبادی بارش سب سیراب کریگی
روشن اپنا مستقبل ہے
سکّہ اور ایکسچینج کا قصّہ ہوگا ختم یہ گورکھ دھندا!
روشن اپنا مستقبل ہے
گھر میں رہے گی گھر کی دولت کھوئی ہوئی ہاتھ آئیگی ثروت
روشن اپنا مستقبل ہے

---

[۱] مرکز سے مراد حکومت ہند ہے جو والیسرائے کے تحت میں ہے۔

اربوں روپے کا اپنا سونا باہر جانا رک جائے گا
روشن اپنا مستقبل ہے

ٹکسال میں اپنی چاندی کو تب سکے ڈھالے جائیں گے
روشن اپنا مستقبل ہے

سونے کا بھی سکہ ہوگا سب سے بڑھیا بہتر سکہ
روشن اپنا مستقبل ہو

۱۰۰ میں ہیں چورانوے بھوکے اُن کے بھی دن پھر جائیں گے
روشن اپنا مستقبل ہو

مرکزی طاقت کا گھٹنا چھ کم سو کا پیٹ بھی بھرنا
روشن اپنا مستقبل ہو

چھ فی صدی ہیں چین سے اب بھی گزرے گی عیش سے تب بھی اُن کی
روشن اپنا مستقبل ہو

ہند کی حالت بہتر ہوگی دنیا بھر میں عزت ہوگی
روشن اپنا مستقبل ہو

چورانوے فیصدی سے مراد کسان مزدور کاریگر اور دوسرے غریب لوگ۔

نئے سال کا خیر مقدم

سنہ ۱۹۳۹ء

ہو نیا سال ہند کو مسعود — ایسے ہی آئیں سو ہزار برس
سامراجی اثر سے ہوں آزاد — حریت سے ہو ہمکنار برس
سب مرادیں دلوں کی بر آئیں — ہو نیا سال یادگار برس
فتح مندی کا لایا ہے مژدہ — نامور اور نامدار برس
لائے جمہور کو حکومت پر — ہو سیاست کا تاجدار برس
رہیں مل جل کے ہندو مسلم — یہی کہتا ہے بار بار برس
وقت جو لا بدل کے آیا ہے — اس کو کہتے ہیں ہونہار برس
نام مٹ جائے گا غلامی کا — اب نہ آئیں گے نابکار برس
جنگ آزادی میں رہی جیت — کہہ رہا ہے یہ ذی وقار برس

یہ نیا سال آپ کو ہو سپھل — ایسے ہی آئیں سو ہزار برس
ان گنت برکتوں کو لائے ساتھ — زندگانی کے بیشمار برس
ابرِ رحمت سے آسماں کہئے — ہاں برس اور ہزار بار برس

یومِ خواندگی کے لئے

مہر جمہوری سنہ ۳۹ء

میں شمعِ علم دنیا میں فروزاں کر کے چھوڑوں گا
جو ہے قصرِ جہالت اسکو ویراں کر کے چھوڑوں گا

مری کوشش سے ہل جائیں گی بنیادیں جہالت کی
جو ہیں حیوان اَن پڑھ ان کو انساں کر کے چھوڑوں گا

مٹا کر ہی رہوں گا ملک سے ظلمت جہالت کی
اندھیری رات کو گویا چراغاں کر کے چھوڑوں گا

جہالت کے سبب سے ہند دوزخ کا نمونہ ہے
خدا چاہے تو اس کو باغِ رضواں کر کے چھوڑوں گا

جہالت دور ہو کر ہوگی تازہ زندگی پیدا
حیاتِ ہند کی دنیا فروزاں کر کے چھوڑوں گا

کتابِ علم کی شیرازہ بندی ہر طرف ہوگی
میں اوراقِ جہالت کو پریشاں کر کے چھوڑوں گا

ہر اک ہندی میں ہے حبِّ وطن کا قدرتی جذبہ
میں اس پوشیدہ جذبہ کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

یومِ نجات کے متعلق قائدِ اعظم کو دو دو باتیں ۱۹۳۹ء

وزارتوں نے جو بالوجہ کام کو چھوڑا — تو سمجھے آپ کہ اب کانگریس کا پاپ کٹا

جلائے آپ نے خوشی کے چراغ بنگلہ پر — ہوا خیال کہ اب آپ ہی کا راج ہوا

جو آپ چاہیں گے مل جائیگا غریبوں کو — رہے گا قوم میں افلاس کا کہیں نہ پتا

بتائیے تو نئے راج کی کوئی برکت — دکھا دیا ہو تو دیا ہو اگر کوئی تحفہ

خبر تو دیجئے نئی چیز گر کوئی ہو ملی — سنائیے کوئی قومی مفاد کا مژدہ

جو کل تھا بیت کا رونا ہے آج بھی باقی — وہی عوام ہیں اور اُن کا ہے وہی رونا

جو بعض شہروں میں تعزیری ٹیکس قائم ہے — ہیں آج بھی تو مسلمان اس سے آزردہ

مزارعین کا قانون کانگریس کی ایج — لگا کے مہر گورنر نے کر دیا پکا

ہے کانگریس کا محکمہ جو ایک گاؤ شعار — وہی محکمہ کہ ہے جس سے آپ کو شکوا

بقول لیگ کے مسلم ہیں اس سے سب محروم — نہ اُس کے فائدوں میں کچھ انہیں حصہ

اسی طریق سے صیغہ یہ کر رہا ہے کام — جو کانگریس کی حکومت کا اصل منشا

پڑھانے کی جو بنائی تھی واردھا اسکیم — سو لیگ کی حکومت نے اس کو کب بدلا

جو اُردو ہندی کی تھی جنگ کیا وہ ختم ہوئی — ملا ہو آپ کو گیا اُس کی فتح کا تمغا

ہے نشہ بندی کا آئین آج بھی جاری — اس عہدہ نے کہ ڈالا نہ اس میں کچھ فرق

ترنگے جھنڈے جہاں گڑ دیے ہیں لہراتے — اور آپ کہتے ہیں کیا غم کہ ہوا کو جھنڈا

وزارتوں کی جو ہو پالیسی ہو گی وہی — خبر تو لیجئے گورنر نے کیا ہے فرمایا
اگر یہ سچ ہے تو پھر آپ کی خوشی بیکار — اگر یہ سچ ہے تو یہ وہم نجات ہے دھوکا
یہ سن کے قائد اعظم نے یوں کہا ہنس کر — نہیں سمجھتے یہ ہے میری لیڈری کی ادا
جو لوگ کہتے ہیں جمہور کی حکومت ہے — یہ چاہتا ہوں کہ دکھاؤں انہیں بُرے دن ذرا

ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری
دیا یہ ہند نے فوراً جواب برجستہ

۱۹۳۹ء
خانصاحب کی صدا

پنشن ہوئی۔ آئی۔ ای کی نہ ہر کو خطاب کی — ایسی ہوا چلی ہے کوئی انقلاب کی
خانصاحبی کو میری بھلا پوچھتا ہے کون — سچ پوچھ وہ بڑھ گئی ہے نشانی عذاب کی
دیتے تھے پہلے اور جواہر کو گالیاں — کہتے تھے بس یہ ایک ہوئی ہے ثواب کی
ان گالیوں پہ شان غلامی کو ناز تھا — تمہید تھی یہ حسن وفا کی کتاب کی
سیلانی اور مخبری وہ اپنے کام تھے — ان خاص خدمتوں پہ بنا تھی خطاب کی
غدار ملک کہتے ہیں اہل وطن مجھے — جو حکمران ہیں ان کی نظر ہے عتاب کی
حکام وہ کہاں جنہیں تھا فخر حسن سلوک — اب وہ فضا نہیں ہے شراب و کباب کی
وہ دعوتیں وہ ڈالیاں خواب و خیال ہیں — رنگینیاں ہیں ختم کسی کے شباب کی
ایسے میں فال بہادری کی خاک کچھ ہوئی — خانصاحبی نے اور بھی مٹی خراب کی

نئے سال کیلئے یومِ خواندگی کا پیغام

سنہ ۱۹ء

ہو آغازِ عیش بارہ برس — تو بھی آج ابرِ نو بہار برس

بہ فصلِ انیس سو جب چالیس — ہو تری عمر کا تہوار برس

وقت چولا بدل کے آیا ہے — تیری آمد ہو خوشگوار برس

ظلم ناخواندگی کا مٹ جائے — ہو پڑھائی سے ہمکنار برس

ہر طرف خواندگی کا ہو چرچا — اپنے حق میں ہو سازگار برس

یومِ تعلیم تیرے ساتھ آیا — تو ہے دنیا میں نامدار برس

رنج پائے گا تو جہالت میں — علم کا بن کے تاجدار برس

تو بڑھ جائے گا خواندوں کی گنتی — تیرا بڑھ جائے گا وقار برس

لٹریسی ڈے منائیں ہم ہر سال — یہی کہتا ہوں بار بار برس

ہو نظامی کی آرزو پوری

خواندگی کو ہو کامگار برس

نظم شکریہ جناب [illegible] الحمد صاحب [illegible] وقت تشریف آوری [illegible]

۵ نومبر سنہ ۱۹۴۰ء

[illegible] شفا خانہ میں [illegible] زندگی — آنکھ کا ہو آپریشن [illegible]

دی خبر مجھ کو کسی نے آئے مولانا طفیل — اس کا سننا تھا کہ تھامیں دل کہ میری ہو گئی

آپریشن جب ہوا وہ بن گئے بیماردار — ہر گھڑی ہر دم ہر وقت کرتے تھے خبرگیری مری

تھی نہ اس میں کچھ نمایش اور نہ کچھ احسان تھا — شرط الفت کی اگر سچ پوچھئے تکمیل تھی

خوش ہوئے جب یہ سنا ہے آپریشن کامیاب — آنکھ میری دیکھ کر کرتے تھے شکر ایزدی

خلق عظمیٰ کا تھا ہمدردی میں انکی پرتوا — دوستی ان کی حقیقت میں تھی سچی دوستی

سچ کہا ہے دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
اے نظامی در پریشاں حالی و درماندگی

مولوی عبد الواجد صاحب کی گرفتاری اور سزا

۲۶ نومبر سنہ ۱۹۴۰ء

تجھ پہ ہیں سو جان سے قربان اے شبان وطن — دل میں تو پوشیدہ تھی اب نمایاں ہونے کو ہے

جنگ اور ہندوستاں کا پیش ہے جو مسئلہ — مسئلہ اب یہ سیاسی معرکہ ہونے کو ہے

جان کی بازی لگا دیں گے محبان وطن — جو دلوں میں بات تھی وہ برملا ہونے کو ہے

رہبروں کیواسطے جو گھر بھی مخصوص تھا — رہبران ملک کا واں جمگھٹا ہونے کو ہے

ہے اسی زمرہ میں واجد سا نحیف و ناتواں — کچھ بھی ہیں وہ گرفتار بلا ہونے کو ہے

قید میں جب وہ گیا یہ جیل سے آئی صدا — حریت کے جذبہ کی نشو و نما ہونے کو ہے

ننھے بچوں کی پریشانی ہے امر فطری — کیا خبر ان کو کہ دنیا کیا سے کیا ہونے کو ہے

عجب برے ہوں گے تو لیں گے سانس آزادی کا
ہاں اب کو ان کے اسی دھن میں سزا ہونے کو ہے

قابل تحسین ہے بیگم صفیہ کا سنکلپ
ان نہیں کہتیں زرفشاں کا جدا ہونے کو ہے

ہند کے کہنے کو کوئی حالات ہیں یہ سازگار
جلد تو قید غلامی سے رہا ہونے کو ہے

تجھ کو کچھ اندیشہ ہو کیا تیرا خدا ہے تیرے ساتھ
غیر کا جبر و ستم ظل ہما ہونے کو ہے

مسلم کا نوحہ اور غیبی آواز

سنہ ۱۹۴۰ء

اک آوارہ وطن گل ہند کی گلشن میں پھرتا تھا
پریشاں حال چہرہ زرد کچھ کھویا ہوا سا تھا

جو پوچھا نام کیا ہے گھر کہاں ہے رو کے یوں بولا
تھی جس کی ہستی نام تھا اس کا نشاں کیا

اکیلا بیکسی کے غیروں نے مجھے بے موت مارا ہے
میں اپنی دنیا سے مٹ چلا ہوں زمانہ کا فسانہ ہے

ہوئی آواز جب اس نے صدا غیب سے آئی
زمانے کے بنائے مٹ نہیں سکتی تری ہستی

زمانہ تجھ کو گر بھاگے تو تو اپنا بنا اس کو
فلک والوں سے کردار کی طاقت دکھا اس کو

ترے کرتوتوں نے تجھکو ذلیل و خوار کر ڈالا
عبث غیروں کا شکوہ اپنا نہ کا عبث شکوہ

وہی اپنا بنے گا جس کو تو غیر کہتا ہے
فلاں ہند کے دونوں میں کچھ غیریت کیا ہے

غلامی سے وطن کو تو ہی چھٹکارا دلائے گا
تو چھا جائے گا دنیا پر اگر ہمت دکھائے گا

جو ہیں اہل غرض ان کی نہ ہرگز بات کو سننا
زباں کچھ اور کچھ کہتے ہیں دل کا اور ہے منشا

مفاد ان کا ہی اس میں گو نشت سے ناخن جدا کر دیں
وہ ڈرتے ہیں کہ جانے یہ ملکر کیا کیا کر دیں

واحد کی رہائی پر

۱۲ اکتوبر ۱۹۴۱ء

چھٹ کے آیا جیل سے واحد مریضِ ناتواں
اس کی استقلال کو صد آفریں صد مرحبا

جیل جب جانے کو تھا اسباب ہم کہتے تھے یہی
تمنا دستی کا تیری ہرگز نہیں یہ اقتضا

جذبہ حب وطن تھا دل میں اس کے موجزن
ایسی باتوں کو وہ سنتا کب یہ ممکن تھا بھلا

اس نے آزادی کی خاطر قید کی سختی سہی
لوگ اس سے پوچھتے ہیں اب نتیجہ کیا ہوا

ہے وہی طوقِ غلامی اور وہی ہے رنج و غم
فرق آقا کے تیور میں نہیں آیا ذرا

زجر اور توبیخ ہیں اس کی نہیں کوئی کمی
اپنی ذلت بھی جو کل تھی آج تک اس سے سوا

صاف اس نے کہہ دیا وہ مسلک ہی اور ہے
تم کجا اور بحر اقیانوس کا وعدا کجا

ناؤ ہے گرداب میں ساحل نظر آتا نہیں
ہے یہی طوفاں تو کیا ہوگا بلالے ناخدا

کہہ چکے احباب جب یہ یاس انگیزی کا راگ
لے کے کروٹ بسترِ غم پر یہ واحد نے کہا

درد دل ہر چند مضبوط ہے ہمت ہے میری برقرار
عزم یہ راسخ ہو تو مایوسی کا کیوں ہو تذکرہ

یہ مسلم ہے کہ دنیا کیا سے کیا ہونے کو ہے
انقلاب دہر میں حصہ یقیناً ہے مرا

ایک پہیلی ہمسر گذشت کیلئے

۲۱ دسمبر ۱۹۴۱ء

بتاؤ تو علی گڈھ کا وہ بوڑھا کون ہے لمبا
کھلا لیڈر نہیں لیکن چھپا رستم ہے کہلاتا
وہ لیگی تو نہیں پر ہے مسلمانوں کا شیدائی
وطن منگلور رکھنے کو علی گڈھ اس کا ہے رہنما

۲۱-۱۲-۴۱

نظامی کون ہے کیا ہے ٹھکانا ہے کہاں اس کا
مفصل تو نہیں معلوم پر معلوم ہے اتنا
نہیں مذہب کوئی اس کا مگر اللہ والا ہے
بدایوں ہے وطن اس کا مگر پھرتا ہے آوارا

۲۱-۱۲-۴۱

جس کو اسلام کے کلچر کی ہوا بھی نہ لگی
اس نے مسلم کی قیادت کی رہبری پائی
قوم کے پاس ہے موجود حدیث و قرآن
کیوں نہ ہو قاید[1] کی ضرورت وہ نہیں ہے اندھی

---

[1] قاید کے لغوی معنی: اندھے کی لکڑی پکڑ کر چلانے والا اندھے کا رہنما۔

نظم

(اُردو)

مبارکباد بتقریب کامیابی عزیزہ صفیہ بیگم عبدالواجد ایم۔ اے بریلی

جون ۱۹۴۲ء

مجسم علم ہو تصویر ہو پڑھنے پڑھانے کی
تمامی صنفِ نازک کے لئے تم اک نمونہ ہو

مفاد البنتہ ہے سچ سچ تمہارے نام نامی کا
تمہارا خلق پاکیزہ حقیقت میں صفیہ ہو

ہمیشہ ہاتھ میں آئے تمہارے گوہر مقصد
مرادیں دل کی پاؤ تم تو واجد کی تمنا ہو

سند ایم۔ اے پرپوس کی جو امسال پائی ہے
وہ اگلی سال کہدیگی کہ تم اردو میں یکتا ہو

نظامی کی دعا ہے یا د عمر خضر دنیا میں
تم اپنے ننھے بچوں کی امیدوں کا سہارا ہو

سلہ واجد کے لغوی معنی پانے والے کے ہیں۔

نامۂ منظوم ۱۹۴۲ء

بخدمت مولانا سید طفیل احمد صاحب

اے طفیل باصفا میرے محبِ باوفا ‏ ‏ یہ خطِ منظوم آئینہ ہے میرے حال کا

جیٹھ اور بیساکھ کے یہ دو مہینے تھے غضب ‏ ‏ ساتھ لائے تھے ہمارے واسطے رنج و تعب

تھی کہاں قسمت ہوا کشمیر کی ہوتی نصیب ‏ ‏ ہو یہ گرما کی سختی جھیلتے تھے ہم غریب

دونوں کی تقدیر میں تھی ابتلا کی ہوا ‏ ‏ آگرہ میں آپ تھے اور میں دہلی میں رہا

جب بریلی میں گیا واں بھی شفاخانہ تھا گھر ‏ ‏ فکر میں مصباح کی ہوتی تھی گھنٹوں میں بسر

میں کئی ہفتہ رہا گھر پہ بفضلِ ایزدی ‏ ‏ اب مرض کی وہ نہیں شدت جو پہلے تھی بپا

آپ نے تکلیف کی حالت میں چھوڑا آگرہ ‏ ‏ راس آئے گی وطن کی غذا آب و ہوا

دور ہوگی تکلیف رفتہ رفتہ کم ہو جائے گی ‏ ‏ گذرے گی آرام سے واں زندگی کی ہر گھڑی

کام سب الجھے رواں تصنیف کے سلسلے ‏ ‏ ختم ہو جائیں گے سارے فکر و غم کے مرحلے

وارڈ میں بھی آپ نے چھوڑا نہ مستقبل کا کام ‏ ‏ آپ کی ہمت بڑی ہے کچھ نہیں اسمیں کلام

ہر طرح سے ہو تحمل اتنی مہلت دے خدا ‏ ‏ زندگی کا آپ کی ہے جو مبارک مدعا

مدعا جو آپ کا ہے وہ نظامی کی خوشی ‏ ‏ زندگانی آپ کی گویا ہے اسکی زندگی

ل کتاب شمائل نگار روشن مستقبل جو اس زمانہ میں زیر تصنیف تھی۔ مصباح الحسن

نواسہ نظامی مرحوم بیمار تھا اسکا علاج بریلی اسپتال میں ہو رہا تھا۔

گاندھی جناح ملاقات

ستمبر ۱۹۴۴ء

ملتے ہیں آج گاندھی و جناح — ہند کی اس ملاپ میں ہے فلاح

یوں تو کہنے کو ہیں یہ دو چار — یہ کروڑوں کے ہیں علمبردار

ملنے کو سب نتیجہ ہیں بیتاب — کیا ملاقات کا ہے لب لباب

منتظر ہیں کہ بات کیا ٹھہری — لیگ اور کانگریس میں کیا ٹھنی

جو حقیقت ہے راز میں ہے ابھی — اُن بھیدوں کی کچھ نہیں ہے کمی

بات کرتے ہیں مسکراتے ہیں — ہاتھ میں ہاتھ وہ ملاتے ہیں

ایسی حالت میں کھینچی ہے تصویر — نظر آتی ہے اس میں اک تنویر

اس کے تیور یہ دے رہے ہیں خبر — ہند کے دن اب آئیں گے بہتر

غیر دیتے تھے ہر گھڑی طعنے — ہند و مسلم میں ہیں چھڑے جھگڑے

ان سے تصویر نے یہ ہنس کے کہا — تفرقہ کا کہیں نہیں ہے پتا

اب سیاست ہے ایک دونوں کی — چاہتے ہیں وہ ملک کی آزادی

لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ کے جھگڑے اور علیحدگی کی صدا

اکتوبر ۱۹۴۴ء

دیا استعفیٰ جھٹ لیگ نے تو کیا ہوا — مگر یوں پھر بھی ہیں امیدوار کیا کہنا

بڑی خوشی کہ یہ دو شعر ہیں آثر[1] نے لکھے — انھیں کو پڑھ کے ہے بادلا اشعار کیا کہنا

"رُباب شعر پہ گاتا ہوں گیت مستی کے — نہ میں ہوں رند، نہ میں بادہ خوار کیا کہنا

"تمام حُسن کی دُنیا تمام کیف و سرور — زمانہ بھی ہو اگر سازگار کیا کہنا"

سُنی جو لیگ کے باغی کی یہ صدا ہم نے
کہا یہ ہنس کے یکایک فرار کیا کہنا

لیگی ٹکٹ والے کے مقابلہ میں بغیر ٹکٹ مانگنے والا لیگی

ٹکٹ نہ لیگ سے مانگا نہ میں بنا سائل — مگر ہے لیگ میں میرا شمار کیا کہنا

ٹکٹ ملا ہے جسے میں بنا ہوں اُس کا رقیب — ہے مجھ سے بھلا کون ہوشیار کیا کہنا

جو دیکھا اس نے کہ میں آ گیا مقابل میں — تو گم ہوئے اُس کے شکیب و قرار کیا کہنا

جو ووٹروں کی ہے کثرت معین ہے میری — نہ لیگ پر ہے میرا انحصار کیا کہنا

یہ سن کے لیگ نے قولِ آثر کو دہرایا
"مری خزاں بھی ہے رشکِ بہار کیا کہنا"

---

[1] خان بہادر مرزا اصغر علی خاں آثر لکھنوی

نبی خانہ بدایوں کا نوحہ خود اسکی زبانی

سنہ ۱۳۶۴ھ کا ربیع الاول مطابق ۲۳ فروری سنہ ۴۵ء

کل نبی خانہ کی جانب جب گذر میرا ہوا
دیکھ کر حالِ زبوں میں نے سوال اس سے کیا

ماہِ مولا آ گیا ہے اور تو اس حال میں
کچھ بتاوے مجھ کو تجھ پر ہے پڑی بپتا یہ کیا

ایک آہِ سرد کھینچی اور دیا اس نے جواب
لٹ گیا سب حسن میرا تھا کبھی آراستہ

اب نہ میری محفلیں ہیں اور نہ مداحِ رسول
بے کسی ظاہر ہے عریاں ہے مرا ممبر کھڑا

نعت کے نغموں کو سن کر پہلے خوش ہوتے تھے جو
اب در و دیوار خود پڑھتے ہیں اپنا مرثیہ

کیا خبر مجھکو ہے خدامِ نبی خانہ کہاں
جانتا ہوں ہاں نہیں میرا کوئی پوچھا گچھا

کہتے ہیں وہ وقت پر قدرت نہیں ہم کیا کریں
کیا کروں ان سے شکایت غیر ہی اپنا بجا

جانشینِ حضرتِ ذاکر جو ہیں عالی مقام[1]
جب یہ قسمت ہی بُری ہو تو عبث ان سے گلا

نامِ عالی کو ہٹاؤں یہ مرا منصب نہیں
حال پر میرے ہی ہیں گر انکار ہو تو ہو بھلا

جنگ کے بعد ہماری امیدیں

سنہ ۱۹۴۵ء

فتح برطانیہ کی امن کا پیغام لائی ہو
زمانہ استفادہ کیلئے تیار ہو جائے

وہ پورا ہو ظفر سے امن عالم کا جو مقصد ہو
یہ دنیا کشت و خوں سے یا خدا بیزار ہو جائے

---

[1] کفیل الدین عالی صاحب متولی نبی خانہ۔

گھڑی سر پر ہیں ان فتنوں کا خطرہ ہو نہ دشمن پھر کبھی زندہ
نہ یہ خطرہ ہو وہ پھر بر سر پیکار ہو جائے

جو منصوبے ہوں بعد از جنگ کے وہ جلد پورے ہوں
کہیں ایسا نہ ہو ان پر عمل دشوار ہو جائے

عمل میں لائے جائیں وہ کہ دور دکھ کا ہو تخمینہ
ہے اندیشہ مبادا آہ بیکس کی پھر بار ہو جائے

ہمارے ہند میں ہو نصیبی خواندگی کا واسطہ
تو پھر تعمیر تربیت کا راستہ ہموار ہو جائے

جہالت اور ضلالت کا ظلم ہے معاذاللہ
یہ دشمن زیر ہوں تو اپنا بیڑا پار ہو جائے

سفر پہ سہج سفر ہو اور نہ کھانا ہے نہ کپڑا ہے
فتح جب ہو مبارک ہند پھر گلزار ہو جائے

ہمارے کارخانے صنعت و حرفت کا مرکز ہوں
نہ بیکاری کا رونا ہو ہر اک باکار ہو جائے

جن ہاتھوں نے چھڑایا سارے عالم کو ظالم سے
انھیں ہاتھوں سے ہم پہ مہر خیر کی بوچھار ہو جائے

سیاست کی صراحی میں جو بھر دی ہے ویول نے
مزا ہو اس کی جب ہندوستاں سرشار ہو جائے

ہو ویول کی صراحی کی کرامت کا نہیں قائل
وہ دشمن ملک کا ہے اس کی مٹی خوار ہو جائے

حکومت ہو گئی لیبر کی لندن میں مبارک ہو
عجب کیا ہے کہ قسمت ہند کی بیدار ہو جائے

وہاں جب آج مزدوروں نے مل کر گل کھلایا ہے
ہمارا بھی وہ ہی گل طرۂ دستار ہو جائے

عروس آزادی مدت سے جو پردہ میں چھپی ہے
مبارک یہ گھڑی آئی ہے اب بیدار ہو جائے

دلا کر فتح جو دعاؤں کی آخر ہوئی منزل
جو کچھ ہونا ہے قسمت میں وہ اب اک بار ہو جائے

"ووٹ کا فیصلہ"

کچھ بزرگوں نے ہیں آزادی کی خاطر دکھ سہے
ہے سیاست آپ کی ایثار سے بالکل جدا
یہ اپنی اپنی رائے ہے۔

دیں گے جب قربانیاں تب ہوگی آزادی نصیب
آپ کہتے ہیں غلط بالکل غلط یہ کلیہ
یہ اپنی اپنی رائے ہے۔

ایک عالم کی اتاری آپ نے پگڑی جناب
ایسی حرکت میرے مذہب میں نہیں ہرگز روا
یہ اپنی اپنی رائے ہے۔

قائداعظم تمہارے ہوں تو ہوں میرے نہیں
گالیاں دوں انکو میں شیوہ نہیں ہے یہ مرا
یہ اپنی اپنی رائے ہے۔

میرا مقصد ہے غلامی سے ملے سب کو نجات
آپ کی مجلس غلامی کی ادا پر ہے فدا
یہ اپنی اپنی رائے ہے۔

تم یہ کہتے ہو جمہ اگانہ الکشن خوب ہے
میں یہ کہتا ہوں نہیں اس میں مفاد عامہ

(یہ اپنی اپنی رائے ہی)

میں یہ کہتا ہوں کہ طاقت ایک جا قائم رہی
تم نے ہی تقسیم وحدت کا وظیفہ رٹ لیا

یہ اپنی اپنی رائے ہی!

تم سمجھتے ہو کہ ہی دارین کی اس میں فلاح
ہی مرے نزدیک تم تو گو کا فقط ایک واہمہ

یہ اپنی اپنی رائے ہی:

میں اسی کو ووٹ دونگا جو ہو میرا ہمخیال
تم کو اس کا کیا گلہ کرتے ہو کیوں چون وچرا

یہ اپنی اپنی رائے ہی

"ایک دوست کی بے اعتنائی سے متاثر ہو کر"

۱۱ اکتوبر ۱۹۲۵ء

گھر مرے دل میں بسایا نہ بسایا ہوتا — کیوں محبت کو بڑھایا نہ بڑھایا ہوتا
ناز برداری کی اپنی مجھے عزت بخشی — بانس پر مجھکو چڑھایا نہ چڑھایا ہوتا

اب کوئی خط ہی نہ ہی نامہ نہ آتا جاتا
مجھ کو بہکاتا جو بہکایا نہ بہکایا ہوتا

جبر کرتا میں دل زار پہ رہتا مجبور
مجھ کو مختار بنایا نہ بنایا ہوتا

آپ ہی جی جو نہ کہتے تو بگڑتا کیا تھا
کہہ کہہ کے افسانہ رلایا نہ رلایا ہوتا

آپ کے جبر نے سب کھول کے رکھ دیں باتیں
راز کیوں مجھ سے چھپایا نہ چھپایا ہوتا

پھر خاموشی کو کیوں تم نے نظامی توڑا
شعر جو ان کو سنایا نہ سنایا ہوتا

مسٹر جینا کا غصہ

کیا مسلمانوں کی یہ تقدیر کا لکھا نہیں
حضرت جینا سے بہتر رہنما ملتا نہیں

ہاں مگر تحریر اور تقریر ہے ضرب المثل
عام اس کی تلخیاں ہیں سب کو کچھ شکوہ نہیں

حال ہی جو حضرت آزاد پر اگلا ہے زہر
واسطہ اس سے معاذ لیگ کا اصلا نہیں

قائد اعظم کی ہاں طینت نمایاں ہو گئی
گالیاں سننے سے کچھ آزاد کا بگڑا نہیں

بدزبانی کا نمونہ تلخ گوئی کی مثال
کوئی فقرہ گفتنی ناگفتنی چھوڑا نہیں

گالیوں کے ساتھ میں آزاد کو سمجھا ہے
ایسے کوسوں سے کوئی بے وقت مرجاتا نہیں

اس کو انگریزی ہی پڑھتے تو ہوتے باخبر
گالیاں دینا کہیں قرآن میں لکھا نہیں

دشمنوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیے
یہ رسول پاک کے اخلاق سے سیکھا نہیں

مغربی تہذیب سکھا سکتی ہے شرم اخلاق
کوئی اسلامی ادب سے دور کا رشتہ نہیں

ا ے کانگریس تحریک ۱۹۴۲ء کے سلسلہ میں جیل جاتے وقت اپنا مختار عام مقرر کیا تھا۔

حضرتِ آزاد اور ان کے ہزاروں معتقد کچھ کہیں ترکی بہ ترکی ان کا یہ شیوہ نہیں

اے نظامی وہ کریں گے صبر خاموشی کہ ہاں ان کا شعار اس سے بہتر زہر کم کرنے کا کوئی نسخہ نہیں

بریلی اور الہ آباد کا خونی منظر دیکھ کر

۷ مئی ۱۹۴۶ء

کیا زمانہ کہہ رہا ہے تجھ سے اے ہندوستاں
انقلابِ دہر کا تو نے سنا ہے کچھ بیاں
کچھ خبر بھی ہے تجھے آزادیاں ملنے کو ہیں
جن کی خاطر لیڈروں نے تیرے جھیلیں سختیاں
زرد چہرہ ہے ترا اور ضعف سے تو ہے نڈھال
فرقہ واری چھوٹ نے تجھ کو کیا ہے نیم جاں
یہ نہیں شکوہ سیاست میں ہوں رائیں مختلف
ہو مصیبت لیڈروں کا تیرے اندازِ بیاں
قابلِ نفرت الہ آباد کی ہے واردات
شرم کے قابل بریلی کی ہیں یہ خوں ریزیاں
ہندو مسلم تو صدہا سال سے رہتے تھے ساتھ
کیا سبب اب وہ بہانے خون کی ہیں ندیاں

رہنما بنتے ہیں جو، ان سے کوئی پوچھے ذرا
قتل اور غارت گری سے آپ ہیں کیا شادماں

وقت یہ نازک ہے جب آئین نو بننے کو ہے
رنگ لائیں گی ہماری تفرقہ اندازیاں

ڈر ہے سارے صوبے میں جائے گی وہ آتش بھڑک
سب سے پہلے تھا علی گڑھ میں اٹھا جس کا دھواں

رہنما جو لیڈر چھوڑ دیں تو رنگ سب جائے بدل
دیکھ لے دنیا ہے ہندوستان کا پلہ گراں

لیڈروں کا ہو اشارہ تو ہوا جائے پلٹ
از سر نو ملک میں قائم ہو پھر امن و اماں

لیڈروں کی عقل آجائے ٹھکانے پر ضرور
عقل سے گر کام لیں سب ملک کے پیر و جواں

آشتی و صلح کی پل کر فضا پیدا اگر یں
بھولے دھوکے بھی نہ ہو کوئی کسی سے بدگماں

ہیں جو لیڈر خود غرض ہم بات ان کی کیوں سنیں
کب صداقت ان میں ہے ایثار ہے ان میں کہاں

وادی پھوٹ خود اپنے لئے مسموم ہے
اپنے ہی ہاتھوں سے لٹ جاتا ہے اپنا کارواں

متحد ہوں ہم تو آزادی بنے اپنی کنیز
ہند کے ماتھے پہ پھر اقبال کا چمکے نشاں

مطلعِ عالم پہ تاباں ہند کا ہو آفتاب
اس کی جو بستی ہے وہ ہو جائے رشکِ آسماں

پھر نئے انداز سے گلشن میں آجائے بہار
بھول کر بھی منہ نہ دکھلائے کبھی فصلِ خزاں

متحد ہو جائیں ہم تو ہند کو سب کچھ ملے
ہو نہ پھر ہند کی تقدیر میں جس کا نشاں

اے نظامی کاش ہو جائے یہ نکتہ دلنشیں
متحد ہندوستاں میں آئی قوت ہو نہاں

قطعات
سیاسی اور اخلاقی

قطعہ

جیل جا کے بھوک کی جھیلی مصیبت بار بار — ہم نے آزادی کی خاطر جو یہ کر با[...]
رائیگاں قربانیاں جاتی نہیں اے ہم نشیں — ہم دکھا دینگے کہ کیا ایثار کا ثمرہ [...]
اے غلام آباد کی فرقہ پرستی آہ آہ — لارڈ پیتھک کا مشن اور اسکی دھمکی آہ [...]
اینٹلی کے راستہ کو چھوڑ کر گمرہ چلے — اس پہ طرہ کہ ہند کی کیا بدنصیبی آہ [...]
کانگریس ہی لیگ کہتی ہے کہ تو سمجھے ہے کیا — گر ملا مجھکو نہ پاکستان تو پھر دیکھ[...]
میں زمیں سر پہ اٹھا لوں گی خبر بھی ہے تجھے — ہے جو شہنشاہ پاکستان اس نے کیا [...]

مسئلہ ہند کی آزادی کا — آخری مرحلہ پہ جب آیا
لیگ کہنے لگی گھبراؤ نہیں — میں ابھی اٹکاؤنگی اپنا روڑا

تضمین بر قطعہ سعدیؒ

سنہ ۱۹۱۴ء

حضور بیگم بھوپال کے جب آئے قدم — اڑا فلک پہ علی گڈھ کے نام کا پرچم
تمام جلسہ کے حضار کہتے تھے باہم — نقد روشوکت سلطان نہ گشت چیزے کم
از التفات بہ افسردہ دل مسلمانے

اس التفات کے ساتھ اور یہ عطائے ہائے مرتبہ بنائی منزل سلطان جہاں وہ قابل دید
کہ جس کو دیکھ کے سب کہہ اٹھے قریب بعید کلاہ گوشۂ مسلم بہ آفتاب رسید
کہ سایہ برسرش انداخت چوں تو سلطانے

لہ سعدی کا قطعہ حسب ذیل ہے جو گلستاں سے لیا گیا ہے:-

زقدر و شوکت سلطاں نہ گشت چیزے کم
از التفات بہ مہماں سرائے دہقانے
کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید
کہ سایہ برسرش انداخت چوں تو سلطانے

سعدی کے اس قطعہ کو دیکھ کر مناسب ترمیم کے بعد یہ قطعہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی دفتر کی عمارت کی بنیاد رکھنے کے واسطے جب ہز ہائینس والیہ بھوپال علی گڈھ تشریف لائی تھیں اور ان کے نام نامی پر سلطان جہاں منزل کا سنگ بنیاد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی کوشش اور انتظام سے رکھا گیا تھا لکھا گیا تھا۔

قطعات

خواب میں دیکھا ہے جو تقدیر کا لکھا نہیں وہم کیوں کرتا ہے تو یہ وہم تو اچھا نہیں
وہم کی دارو تو دے سکتا نہیں لقمان بھی ڈاکٹر کے پاس بھی اس وہم کا نسخہ نہیں

خواب جو دیکھا ہے کب تقدیر کی تحریر ہے
پوچھتا ہے کیوں ہر اک سودائی کیا تعبیر ہے
خواب کہتے ہیں جسے تخئیل کا ہے پرتوا
وہم انسانی کی چلتی جاگتی تصویر ہے

میری تقدیر سے پوچھے کوئی وہ کیا کر لیگی
کیوں ڈراتی ہے گھڑی کیا وہ مجھے کھا لیگی
کیوں قیامت کا مجھے ڈر ہو کہ اس سے پہلے
ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی

فکر فردا میں تو بیکار گھلا جاتا ہے
موت کے نام کو سن سن کے مرا جاتا ہے
جان ہے جس کی امانت وہی لیگا اسکو
کیوں تجھے غم ہے ترے پاس سے کیا جاتا ہے

کہتے ہو جب سے دیا تو نے دل شیدا مجھے
چین اُس نے کچھ دیا تکلیف میں ڈالا مجھے
اس کو کیوں بدنام کرتے ہو کہ وہ منحوس ہے
پھیر دیتے کیوں نہیں بہتر ہے میرا دل مجھے

جاں بلب آیا ہوا بدحال جب دیکھا مجھے
آپ نے بھیجا جو اکسیر کا دیا نسخہ مجھے
وقت رخصت آ گئے پھر بھی عیادت کیلئے
مہربانی کی جو اب بھی آپ نے پوچھا مجھے

کیوں بھری محفل میں سب کے سامنے چھیڑا مجھے
کیا ہے باعث جو کیا سب کے بے پردہ مجھے
اے نظامی نا ہمیں جب نا رسائی ہی ملی
تم نے اچھا ہی کیا نظروں سے جو دیکھا مجھے

ایفائے وعدہ کا جواب

۱۹۳۹ء

وعدہ دلایا یاد تو کہنے لگے کہ ہاں — جو بات آپ کہتے ہیں ہوئی ضرور ہے
موقع نہیں ہے آج ذرا صبر کیجئے — جی ہے نڈھال اور بدن چور چور ہے

دشمن کی بے شعوری

دشمن نے کیا غضب کے نکالے ہیں ہاتھ پاؤں — گستاخ ہو گیا ہے بہت بے شعور ہے
طاقت یہ ہو گھمنڈ ہمیں جانتا نہیں — شہرہ ہماری چال کا نزدیک دور ہے

عقل میں فتور

اک چال جب ہماری وہ ہو جائیگا فنا — دھوکے میں کیوں پڑا ہے یہ جھوٹا غرور ہے
رہ جاؤ باز ورنہ [illegible] آجائے گی بلا — کہہ دے کوئی کہ عقل میں تیری فتور ہے

سمجھ کا قصور

ہم نظم میں [illegible] کے [illegible] جواب — ہنگامہ گشت و خون کا یہ قصہ ضرور ہے
اس بار دھاڑ میں ہیں کہتے ہیں جو برا — سچ تو یہ ہے کہ اُن کی سمجھ کا قصور ہے

صوبوں کی وزارتوں کے استعفوں کے بعد

گاندھی کے فارمولے سے نکلا نہ کوئی کام | آخر کو تھک کے رہ گیا آزاد سا امام
یورپ میں جنگ چھڑنے سے آخر کو ہو گیا | آئین نو کے قصر تعاون کا انہدام

ہندوستان کی قومی زندگی کے اجزاء

سنہ ۱۹۴۰ء

خوب فرماتے ہیں مسٹر ایمرے عالی مقام | ہند کی گتھی کو سلجھانا نہیں آسان کام
کانگریس بھی خوش رہے اور لیگ بھی راضی رہے | والیان ملک کا بھی کم نہ ہو کچھ احترام

پہلے تم نے ہی ہوا میں تھا مچایا تہلکہ | دیکھو برٹش نے جواب اس کا تمہیں آخر دیا
ان کی قوت کو فضا میں تم سمجھتے تھے حقیر | دیکھی برٹن کے ہوا بازوں کی برتریاں

مغرب کے نقال

سنہ ۱۹۴۰ء

مغربی نقال بن کر کھو دیا اپنا اثر | عیب کہتے تھے جنہیں پہلے وہ ٹھہرے اپنے ہنر
مشرقی تہذیب کا افسانہ یوں ظلم رفتار | یاد رکھتے تم اگر خذ ما صفا ودع ما کدر

مجھ سے تمہیں خلوص ہے وہ بہ سر بسر غلط
میں تم کو دوں فریب اڑی ہے یہ خبر غلط

جو کچھ بھی ہو گیا ہے زمانہ کا اقتضا
سمجھے ہیں لوگ آہ کا میری اثر غلط!

مسلم لیگ کی پالیسی

کونسل میں جانے سے کب لیگ کو انکار ہے
کچھ نشستیں اور مل جائیں یہی اصرار ہے

ہے اگر انکار بھی تو ہے تعاون انکے ساتھ
سچ تو یہ ہے رہنما اس کا بہت ہشیار ہے

کانگریس کے لیڈر

گھر لٹائے ہوئے کچھ خانماں برباد بھی ہیں
دل گنوائے ہوئے مجنوں بھی ہیں فرہاد بھی ہیں

دیکھئے تاکتی ہے اس کی نظر کس کس کو
سامنے اس کے جواہر بھی ہیں آزاد بھی ہیں

جنگ عظیم کے منصوبے

کل محل پر شاہ کے جب ایک بھاری بم گرا
حضرت عیسیٰ کا سچ مچ معجزہ سا ہو گیا

شاہ بھی موجود تھے لیکن نہ آئی اُن پہ آنچ
ان کے ہمراہی بچے دشمن ندامت سے مرا

نازیوں کو تھا ان دعووں پہ کل تک ناز تھا
جا کے لندن میں سیر کریں گے جائے کھائیں گے ہم ا

پوچھتے ہیں لوگ ان سے کہ اب وہ دعوے کیا ہوئے
ہینڈرسن دو گئے ٹیٹ گئے چیمبرلین اور ہٹلر بھی چلا

صوبوں کی وزارتوں کی ترک کے بعد

۱۹۳۹ء

گاندھی کے فارمولے سے نکلا نہ کوئی کام ناکام تھک کے رہ گیا آزاد سا امام
یورپ میں جنگ چھڑنے سے آخر کو ہو گیا آئین نو کے قصر تعاون کا انہدام

گاندھی کے فارمولے نے آخر کیا یہ کام لندن میں اور ہند میں سب خوش ہیں خاص و عام
کرتی نہ کانگریس اگر انجام پر نظر فوراً ہی ہوتا قصر تعاون کا انہدام

مسلم لیگ کے قائد سے

مرحبا زورِ قیادت کا دکھانے والے مرحبا لیگ کو گرنے سے بچانے والے
پیشکش لینے کا نقشہ نہ کھنچا پر نہ کھنچا تھک گئے صلح کی تصویر بنانے والے

کر دیا اُس نے تعاون سے وہ ناشاد ہے قائد اعظم تو اس فن میں بڑا استاد ہے
جو سروں کی ہے جماعت اُن سے وہ مجبور ہے کون کہتا ہے کہ مجلس لیگ کی آزاد ہے

پیشکش ٹھکرائے جانے کی جو کچھ بنیاد ہے اُس سے ظاہر لیگیوں کی طبع کی افتاد ہے

خوش ہیں وہ دروازہ امید ہی اب تک کھلا
فنائے اعظم حقیقت میں بڑا استاد ہی

گئے کونسل میں تو بولے اچھل کر
دوبارہ ہوئی لیگ زندہ سنبھل کر
نہ پوچھو شب ہجر کیسے بسر کی
"یہ کروٹ بدل کر وہ کروٹ بدل کر"

سنہ ۱۹۴۰ء

مرد اور عورت کا رشتہ

زوجیت میں آکے ہو جاتی ہی عورت چھوئی مُوئی
عشق حائل ہو تو ہو جاتی ہی پھر بیوی وہی
پھر تو سچ مچ مرد ہو جاتا ہی عورت کا غلام
اُس کے گھر میں اب نظر آتی ہی اک ڈیڑھ بنائی

بڑھاپا

پیری ہی کون پوچھے کہ کیا گل کتر گئی
جو کام کرنے آئی تھی وہ کام کر گئی
دیکھا جو اس نے مجھ کو نحیف و نزار ہی
کہنے لگی تمہاری جوانی کدھر گئی

راہ کی گمگشتگی

محفل میں تیری آکے سراپا ہوئے الم
ہر وقت سامنے تھی ہمارے رہ عدم
اپنوں کی رہنمائی سی گم گشتہ راہ ہیں
غیروں سے پوچھتے ہیں کہ جائیں کدھر کو ہم

سنہ ۱۳۶۴ھ کا رمضان

سنہ ۱۹۴۵ء

جب سنائیں لارڈ ویول مژدۂ فرحت فزا — وہ ہماری عید کا ہنگام ہونا چاہئے
خیر شاید عید تھی روزوں میں جوار کی فقط — نہ پوچھو گیہوں چنے کی ہوئی کیوں قلت

چنے کی دال میسر نہ میٹھی روٹی
سحر ہی میں نہ افطار میں ملی لذت

سنہ ۱۹۴۰ء

گرے پڑتے ہو حق حباب ناتواں ہو کر — نظر آنے لگے تم پیر مرد و نوجواں ہو کر
رفاقت چھوڑ دی اس نے جسے تم دوست سمجھے تھے — اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

مطمئن کل تھا اسے آج پریشاں دیکھا — جو منظم تھا اسے بے سر و ساماں دیکھا
آٹھ آٹھ آنسو بیاباں میں کھڑا روتا تھا — اس کو مجنوں کی طرح چاک گریباں دیکھا

کیا سراسیمگی ہے کیا یہ پریشانی ہے — دل میں دنیا سے گذر جانے کی کیوں ٹھانی ہے
ظلم سے ہاتھ اٹھا کر وہ ہوا ہے تائب — قابلِ رحم ستمگر کی پشیمانی ہے

عید سنہ ۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء

عید کے دن یاد ہے ان بھائیوں کی در کشمیر	جن کے بچے ہیں کہیں وہ ہیں لڑائی میں کہیں
ان کا جذبہ ہے مبارک ان کی جرأت واہ واہ	ان کو ہے شاباش ہمت کو ہزاروں آفریں

عید آئی ہے مصیبت جنگ کی ہے ہر رکاب	اس لڑائی کا نتیجہ ہے یقیناً انقلاب
پنجۂ صیاد سے آزاد ہو جائیں گے ملک	نازیوں کے ظلم کا آخر کو ہوگا سد باب

عید الفطر سنہ ۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء

عید آئی مگر بشدید آئی	جنگ کی فکر ساتھ میں لائی
گھی بھی مہنگا ہے دودھ بھی گراں	ہیں سوئیاں نہ شیر یا لائی

عید میں ہر طرف ہے سناٹا	اچھے کپڑے ہیں اور نہ اچھی غذا
بچے روئیں تو ان کو سمجھا دو	ہم کو دینا ہے جنگ کا چندہ

ہے مصیبت کی عید کیا کیجے	بیٹھے جھوٹی ہنسی ہنسا کیجے
جائیے عیدگاہ پڑھیے نماز	فتح برٹش کی ہو دعا کیجے

جنگ میں کیا کام دیگی اچھے کپڑوں کی جھلک — جیب میں نقدی ہو تو کچھ لطف دے اس کی کھنک
بچے کہتے ہیں ہمیں عیدی ملے چندہ نہ دیں — گر نہ دیں گے ماسٹر غصہ سے جائیں گے چمک

ستمبر ۱۹۴۰ء

مسئلہ حل ہو گیا آزادیٔ تقریر کا — دیکھئے گا وہ اسٹیج اور دیکھیں گے پھر بس کا فرا
انفرادی طور پر ہوں گی یہ نافرمانیاں — رفتہ رفتہ جیل کی سب طے کریں گے جاترا

رتن کے خواب کی تعبیر کیا یہ ہونے والی ہے — وہ ڈھائی جائیگی تعمیر جو اب تک بنالی ہے
مقامی بورڈوں پر جو جہالت کا ہے بھوت چھایا — سول سروس کی ذہنیت نہ ایسی چھانے والی ہے

قائد اعظم لقب تم کو ملا بالکل بجا — لفظ قائد کے لغت میں دیکھ لو معنی ہیں کیا
ساتھ جانے والے جائیں گے جدھر لیجاؤ گے — ان غریبوں کو نظر آتا نہیں ہے راستہ

وائسرائے ہند کی جو کونسل بننے کو تھی — کانگریس اور لیگ دونوں ہی نے بننے نہ دی
کچھ حکومت کا نہ بگڑے گا چلیں گے کام سب — آپ نہ دیکھیں تو یہی برطانیہ کی پالیسی

برت گاندھی نے سنتے ہیں کیا اعلان ہے — لوگ کہتے ہیں کہ جانبازی کا یہ سامان ہے
کام نکلے ملک کا اس سے یہ مشکل بات ہے — فاقے کر کے جان دیدیں اُن کو یہ آسان ہے

خاموش فتحپوری کی فرمائش پر اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

ترے غم کے خاموش پیلے رہیں گے
مجھے کیا جو تہمت پہ حیلے رہیں گے
تو خاموشی کو توڑ کر سب سے کہہ دے
اکیلے رہیں گے اکیلے رہیں گے!

ایک دوست سے خطاب
سنہ ۱۹۴۰ء

کیوں مجھے بندہ بنایا نہ بنایا ہوتا
کیوں غم سے دل کو لبھایا نہ لبھایا ہوتا
اب نہ کچھ خیر خبر ہے نہ ملاقات کا ذکر
پہلے کیوں ربط بڑھایا نہ بڑھایا ہوتا

سنہ ۱۹۴۰ء کی انفرادی نافرمانی

ونوبا بھاوے کی تقریر ہو تو کیا نتیجہ ہو
جو سننے والے ہوں گر دیکھئے ان کیلئے کیا ہو
پریشانی نہ ہوگی اور نہ ہوگا امن کو خطرہ
خدا سے یہ دعا ہے کانگریس کا قول پورا ہو

بنتی ہے دنیا نئی آیا ہے وقتِ امتحاں
انقلابِ دہر میں تم ڈھونڈ لو اپنا نشاں
آج رکھ لو شرم تم جمہوریت کے نام کی
کل نظر آجائے گا پہنچا کہاں ہندوستاں

منہ پھیر کے مجھ سے جانے والے
میری ہنسی مٹانے والے
معلوم ہے تیرا خیال دکھ کا
الٹی گنگا بہانے والے

جھوٹی باتیں بنانے والے　　مجھ کو بنا بتانے والے
لیسلے میرا اسلام لے لے　　مجھ سے آنکھیں چرانے والے

اُردو زبان

سنہ ۱۹۴۰ء

جو وہ بنگالی یا ہو گجراتی　　اُس کو اُردو زبان نہ آتی
پر نہیں ہے نگاہِ شوق سے کم　　آتے آتے بھی وہ نہیں آتی

دشمنِ نبی سے خطاب

سنہ ۱۹۴۰ء

نہ وہ تازگیں ہی باقی نہ وہ مجری حالے　　البتہ اگر ہے کہ رہتا ہے تو شاید ہو گا
تیری چالوں کو سمجھے ہیں سمجھنے والے　　کتنے پانی میں ہے تو سب نے تجھے جان لیا

کانگریسی لیڈر سے خطاب

تو جو کہتا ہے کہ آزادیٔ تقریر ملے　　دل میں جو بات ہے انسان کی بچوت نہ کہے
تیرا کہنا بھی بجا اُن کا یہ خطرہ بھی بجا　　نہ کہیں قوتِ گویائی تری کھل کھیلے

سنہ ۱۹۴۰ء

وفا شعار زمانے کو جب نظر گئے　　تو اُس نے غیر کو فوراً اٹھا لیا سر پر
مگر جو غیرت نے بنی تیغ کے حلال کیا　　نہ توپ کام میں آئی نہ کچھ چلا منتر

پڑا جو وقت پکارا نیاز مندوں کو ۔۔۔ نہ ہاتھ آئے وہ سب ہو گئے رفو چکر
صدا یہ غیب سے آئی کہ صبر کر احمق ۔۔۔ گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

"ولایتی نہیں"

مری بات کو ایک دن مان لو گے ۔۔۔ زمانے کے تیور جو پہچان لو گے
نہیں اے مری جان ہو جائے گی ہاں ۔۔۔ نتیجہ نہیں کا اگر جان لو گے
زباں سے نہیں آپ نے کیوں نکالی ۔۔۔ "نہیں" آپ کی ہے مری دیکھی بھالی
نہیں کا یہ شعلہ بجھے گا بجھے گا ۔۔۔ زمانہ نے اس پر اگر چھینٹ ڈالی
"نہیں" کا خدا جانے انجام کیا ہو ۔۔۔ جو ہو جائے کچھ نیک وبد تو مزا ہو
خدا کے لئے اپنی ضد چھوڑ دیجے ۔۔۔ رہی ہٹ یونہی تو تماشا نیا ہو

زندہ دلی ۱۹۴۰ء

تو چھوڑ کے کیوں ہم کو گئی، زندہ دلی ۔۔۔ خوش رکھنے ہیں تیرے نہ کبھی کی تھی کمی
جیتے تو ہیں پر جینے کا کچھ لطف نہیں ۔۔۔ زندہ نہیں دل سوگ ہے اس کا طاری

اے زندہ دلی تو نے ہمیں چھوڑ دیا ۔۔۔ جل دو ہو نہیں ہم کو ترا کچھ شکوہ
اب جینے تو ہے روز کا رونا تو نہیں ۔۔۔ ہم نے بھی دل زندہ کا قصہ چھوڑا

وہ دل ہے کہاں جس میں امنگیں تھیں بھری ۔۔۔ وہ جسم کہاں جان تھا جو چستی کی

صورت یہ نمایاں ہے ضعیفی کی نمود — پھر لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمت ہے بڑی

احباب کے جلسوں کا جو آتا ہے بلاوا — کہتا ہوں کہ کیا جاؤں میں لیکر دل مردہ
جاتا تو ہوں کہتے ہیں مجھے دیکھ کے چپ چپ — افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

صد عیب ہے پیری کو کیا کرتے ہیں بدنام — وہ کیا ہے جوانی جو ہو وقف مے و گلفام
اس پیری پہ قربان جوانوں کی جوانی — فرزانگی ہے جس کی بن آتے ہیں سب کام

نجات مظالم کا دن جب منایا — خدا جانے پیش نظر کیا تھا نقشہ
وہ نامہ بر سنتے ہیں اب راس آئی — وزارت ہے ان خدمتوں کا نتیجہ

مسجد ادھر پاکستاں کی ہے قیادت — کل ہند کی ملتی ہے ادھر مجھ کو صدارت
بکھروں جو قیادت کو تو جاتی ہے وزارت — غالب کی طرح میری ڈانواں ڈول ہے حالت

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

مسلم لیگ کی نہیں

تمہاری نہیں کی تھی اتنی حقیقت — کہ مل جائے کچھ لیگیوں کو وزارت

گرفتاریاں ان کی ہوں جیل جائیں | جو جمہور کی چاہتے ہیں حکومت
تمہاری نہیں کا کھلا آج عقدہ | مِن و تو کا باقی رہا کچھ نہ جھگڑا
مبارک یہ فتویٰ مبارک یہ خواہش | غلامی کا ہو جائے مضبوط رشتہ
نہیں کہہ گئی راہ تک گیت گائے | مگر سُن کے پیغام وہ مسکرائے
مسرت کا ان کی نہ تھا کچھ ٹھکانا | وزارت کے دو چار لقمے جو پائے

زندگی کا راز

پیدا ہوا تو آئی یہ آواز زندگی | انسان جانتا نہیں کچھ راز زندگی
ہنس کر کہا یہ ہم نے غلبی نے کان میں | پیغام موت کا ہے یہ آغاز زندگی

مسلم لیگ کی نہیں

۱۹۴۰ء

(۱)

"نہیں" ہو نہیں ہے نہیں کا زمانہ | نہیں ہیں تمہاری ہے ہاں ہم نے مانا
نہیں چھوڑ کر صاف ہاں نیچے گا | نہیں تو نہیں کا بنے گا فسانا

(۲)

نہیں ہیں تمہاری ہے انداز ہاں کا | نہیں کا نہیں ہی ہے نہیں کوئی شکوہ
نہیں کی لگاؤ گے تم رٹ کہاں تک | تمہاری نہیں ہے ہمیں آزمانا

(۳)

لیڈر کی نہیں یا کسی معشوق کا انکار | دونوں کی نفی ہیں چھپے وصل کے آثار
وہ میل حکومت سے ہے عاشق سے ہے یہ وصل | دونوں کی غرض یہ ہے کہ اکدم نہ ہو اقرار

لیڈر سے خطاب

کیا ڈر ہے آپ شوق ہو لیڈر بنا کریں — لیکچر سنائیں ملک کے ٹکڑے کیا کریں
جس طرح چاہیں قوم کو بیچے رہیں غریب — آزادی کا مگر نہ کبھی تذکرہ کریں

اپنوں کی شکایت

مارا ہے ہم کو غیر نے نوحہ کیا کریں — دنیا سے وہ مٹے یہ وظیفہ پڑھا کریں
یہ سب غلط ہے اپنوں کے مارے ہوئے ہیں ہم — اپنے ہی جب ستائے ہوں کس کا گلہ کریں

نہ مر جانے کی فرصت ہے نہ جینے کی اجازت ہے — ہم اک مجبور قیدی ہیں ہماری یہ حقیقت ہے
ہمارے گھر جو منصوبے ہوئے وہ یکدم غائب — نظر جو آرہی ہے دور سے وہ اور صورت ہے

الف لیلیٰ میں تسمہ پا کا ایک قصہ پڑھا ہوگا — پرانی ہے کہانی آنکھ سے اب تسمہ پا دیکھا
چمٹ کر رہ گئے ہیں لیگ کو کرسی نہ چھوڑیں گے — جناب قائد اعظم حقیقت میں ہیں تسمہ پا

نہ سنتے ہیں کسی کی اور نہ کچھ کہتے ہیں ہم اپنی
لگی ہے ڈاٹ کانوں میں ہے لب پر مہر خاموشی
زباں سے کہہ نہیں سکتے نہ روتے ہیں نہ ہنستے ہیں
یونہی گھٹ گھٹ کے مر جائیں یہ ہے صیاد کی مرضی

عید کے دن اب مسرت کا کہاں ارمان ہے — یاد فرمایا مجھے یہ آپ کا احسان ہے

قطعۂ شکریہ انبیعضا ڈاکٹر بابو پیر رضا گپتا صاحب اسسٹنٹ سرجن بہرائچ

(آپریشن کے بعد یکم جنوری سنہ ۱۹۴۱ء)

اب طبیعت فکر سے آزاد ہو | چشم من روشن دل من شاد ہو
اے نظامی شکر کران کا ادا | ڈاکٹر گپتا کی یہ امداد ہے

قطعۂ مبارکباد سید بشیر حسین صاحب زیدی چیف منسٹر رامپور کو سی۔ آئی۔ ای کا خطاب ملنے پر

یکم جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

بشیر قوم کے رتبے بڑھیں یہ تھی دعا | "دعا قبول ہو" دی غیب سے کسی نے ندا
یہ سال نو ہو مبارک جناب زیدی کو | "رفیق سلطنت ہند" کا خطاب ملا

زندگی کا فلسفہ

۱۷ ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء

زندگی کیا ہے اور فنا کیا ہو | حل نہ ہوگا یہ وہ معمہ ہو
آتی جاتی ہو سانس بیٹھے ہو | رک گیا دم تو پھر سویرا ہو
زندگی آئی ہو فنا کے لئے | یہ فنا ہے مگر بقا کے لئے
ہو فنا اور بقا سے کیا مطلب | یہ نہ پوچھے کوئی خدا کے لئے

جو یہاں آیا ہے اسکو ہی وہاں جانا ضرور / آنی جانی ذات کو شایاں نہیں ہرگز غرور
زندگی کو ہے فنا تو موت کو بھی موت ہے / اس فنا کا فلسفہ آیا سمجھ کچھ حضور

چاندنی شب ہے مگر افسردگی چھائی ہوئی / شمع بھی روشن ہے لیکن ہے وہ شرمائی ہوئی
جھلملا کر بجھ رہے ہیں اب چراغِ آرزو / وقت رخصت ہے مصیبت جان پر آئی ہوئی

۱۷ ستمبر ۱۹۴۱ء

لوگ کہتے ہیں غلامی ہند کی ہے بے نظیر / دور اور نزدیک ہیں مجبوریاں اسکی شہیر
اسکو آزادی ہو کیوں تحریر کی تقریر کی / یہ مسلم ہے غلاموں کے نہیں ہوتا ضمیر

کانگریسی تو بہت ہیں نام کے / ہیں انھیں میں آدمی کچھ کام کے
ان کو کیا عیش و مسرت سے غرض / ہیں وہ دلدادہ فقط آلام کے

نہ بندوق ہے اور نہ تلوار ہے / فقط نفس کا اپنے ایثار ہے
اہنسا کو سمجھا کرے کوئی ہیچ / مگر بیکسوں کا وہ ہتھیار ہے

جبر اور ظلم ہے طاقت کا کرشمہ ٹھہرا / نام جمہوری کا دنیا نے اطاعت رکھا
جبر او ضبط ہی ہے جبر و تعدی کا علاج / ہے یہ مظلوم کی خاموشی بھی اک طرفہ دوا

غرور کا سر نیچا

۳۰ نومبر سنہ ۱۹۴۷ء

وہ دن گئے کہ اس کی زمیں پر تھی آسماں — زیر زمیں بھی اب نہیں ملتا کوئی نشاں

یاد شن بخیر آج وہ آیا ہے ہم کو یاد — ڈھونڈیں تو چل کے اسکو وہ غائب ہوا کہاں

غیرت کا تقاضہ

سمجھا کسی نے خوب کہ چہرہ تو دیکھئے — باقی اگر رہا ہو اب بھی تماشا تو دیکھئے

فرماتے ہیں کہ غیر کے گھر تک چلے چلو — غیرت کا آپ کی یہ تقاضا تو دیکھئے

پچھتاوا

سرگشتہ زیر گنبد نیلی رواق ہے — میری تلاش میں ہی عجب اتفاق ہے

جب یہ سنا کہ میں تو جہاں سے گزر گیا — کہنے لگا جدائی نظامی کی شاق ہے

درندگی کو مات

سنہ ۱۹۴۱ء

خبر یہ چھپی ہے لندن سے آج یو پڑھے — درندگی کو کیا مات اب تو ہٹلر نے

جہاز بچوں کا جاتا تھا جو کینیڈا کو — ڈبو دیا اُسے ہنس ہنس کے اس ستمگر نے

حادثہ مہیب

جہاز میں جو مسافر تھے تین سو کے قریب — نہ پوچھو کتنے ہوئے غرق حادثہ تھا مہیب

تباہ ہو گئے بچے بھی اور مائیں بھی — گناہ یہ تھا کہ لندن سے آ رہے تھے غریب

استقلال کی تصویر

ہمت افزا ہز مجسٹی کی ہی تقریر ہے | قوم انگریزی کے استقلال کی تصویر ہے
لٹ گئی قربانیوں کی اسپرٹ آخر فتح | ریڈیو سے بس ابھی پیغام کی تشہیر ہے

معصوموں سے ہمدردی

بحر اوقیانوس جب معصوموں کا مقتل بنا | بحر ہمدردی میں آیا شاہ کا اک جوش سا
ہوگیا معلوم سب کو شاہ کی تقریر سے | یہ خبر سُن کر بنا شاہی محل ماتم کدہ

صبر کا میٹھا پھل

ہند ناچار ہے بیکس ہے کمزور کیا شکوہ | آج پیغام میں کچھ ذکر نہ اس کا آیا
فتح برٹن کی ہو تو ہند کے سب کام بنیں | صبر کرتا رہے وہ صبر کا پھل ہے میٹھا

سائیکل کے حادثہ کے بعد بتقریب صحت احمد الدین سلمہ

اگست سنہ ۱۹۴۲ء

یہ سائیکل کی ضرب نمونہ بلا کی تھی (۱) پھر بھی امید مجھ کو خدا سے شفا کی تھی
احباب آتے تھے جو عیادت کیواسطے | انکی تسلیاں تھیں کہ رحمت خدا کی تھی

(۲)

خدا نے دکھایا یہ روز سعید | کہ پھر مر کے زندہ ہوئے پھر احمد
نظامی کی مایوسیاں اب کہاں | کہ پھر سبز ہے اب تو نخل امید

(۳)

میرے غریب خانہ کا کیا پوچھتے ہو حال — عشرت کی وہ بنا ہے وہاں غم کا کیا سوال
دیوار و در سے آتی ہے ایسی ہی صدا — گویا ہے اپنے فن کا دکھایا بڑا کمال

(۴)

اے سائیکل خدا کے لیے مجھ کو یہ بتا — مضروب کیوں احبہ کا بیدردی سے کیا
ناگاہ اس نے تیرا کیا ہو کوئی قضیہ — میرے دل شکستہ کو کیوں تو نے دکھ دیا

(۵)

کمبخت سائیکل کا ستم تھا یہ ناروا — احباب تھے جو وہ پریشاں انہیں کیا
آئے خطوط اُن کے پیامات بھی بہت — میں کس زباں سے اُن کا کروں شکریہ ادا

عید الضحیٰ کے دن بمقام الہ آباد

۱۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۲ء

اس سال بھی نصیب میں اپنے نہ گھر کی عید — تھی دکھ بھری نظامی ہماری سفر کی عید
دل ہی نہ جب ٹھکانے تو پھر کیا خوشی کا ذکر — آزار سے نجات ہو تو ہے بشر کی عید

لہ رائے صاحب ڈاکٹر بابو بہرشاد گپتا میڈیکل افسر بدایوں۔

گھر آکر عید کے ایک ہفتہ بعد۔

لہٰذا یہ پہنچی کذب کی لعنت خدا کا قہر — اور اس طرف حمق کے مرّوت خدا کا قہر
کہنے کو یوم عید تھا لیکن شب یہ تھا — بچّوں کی تھی نرالی مصیبت خدا کا قہر

عشرت کدہ میں آج مصیبت بپا ہوئی — دولت گلے کا ہار بنی اور بلا ہوئی
جھوٹی پیغمبری کا جو تھا نہ ہوا تھا — مکر و فریب کی اسے لعنت عطا ہوئی

جنوری ۱۹۲۲ء

نہیں شکستہ پری میں کوئی کسر باقی — رہا نہ طاقت پرواز کا ہنر باقی
سُنا ہے ان کی بھی ہیں پیش نظر قطع و برید — جو اتفاق سے کچھ رہ گئے ہیں پر باقی

چہل پہل وہی دُنیا کی ہے وہی عالم — یہ سب غلط کہ نہیں اس کا شور و شر باقی
وہی ہے رات وہی رات کی سیاہی ہے — وہی ہے نور سحر کا وہی سحر باقی
ہے آفتاب وہی دھوپ کی وہی گرمی — وہی ہے چاندنی اُس کی وہی قمر باقی
وہی تغیّر موسم کی وارداتیں ہیں — وہی بہار خزاں کا وہی اثر باقی

وہی نظامی ہے اور ہے وہی فضائے وطن
یہ سب درست، مگر ہے بڑا سفر باقی

گاندھی جناح ملاقات کا انجام
سنہ ۱۹۴۴ء

حال سُننے کیلئے جس کا تھی دنیا بے کل — لوگ کہتے ہیں ملاقات ہوئی وہ نہ سپھل
گوری امت نے بصد طنز کہا ہنس ہنس کر — ہند پہ چھایا ہوا ہے ابھی کالا بادل

بمبئی میں مسٹر عزیز الحق کی جب آئی ہستی — سب یہ کہتے تھے کہ سمجھوتہ نہ ہوگا اب کبھی
دونوں لیڈر مل کے بیٹھے بھی مگر ایکا کہاں — ہندو مسلم میں باقی ہے سیاست کی دوئی

ان ملاقاتوں کا سوچو یہ ہوا انجام کیوں — لیڈری کی نہ تہنیت کو یوں کیا بدنام کیوں
لاج رکھی ہند کی تو نے نہ اللہ بانہ جی — تو ہی اے برلا محل کہہ دے ہوا بدنام کیوں

عید الفطر سنہ ۱۳۶۳ھ ۱۹۴۴ء

عید کا دن ہے گلے مل لے دل رنجور نہیں — فاقہ مستی کی ہو فریاد نہ یہ دستور نہیں
کی شکایت بھی کسی نے تو وہ ہنس کر بولے — کیسے کم ظرف ہو کچھ ضبط کا مقدور نہیں

فتح برٹش باعث آرام ہونا چاہیے — ہند کو وہ عیش کا پیغام ہونا چاہیے
اپنی ناداری کا مستی سے ہو کچھ غم غلط — عید آئی آج دور جام ہونا چاہیے

ہم مسلماں ہیں ہمیں بھی شکر ایماں چاہیے | عید کا دن ہے مبارک تم کو ہر دل چاہیے
چیتھڑے تن پر ہیں کھانے کو نہ دو نہ بیت ہے | عید کے دن اور کیا مسلم کو ساماں چاہیے

ادب سے تیس روزوں کے رہی گونگی زباں میری
یہ روز عید ہے اے کاش سن لیں وہ فغاں میری
خدا سے ہے دعا کھانا ملے کپڑا میسّر ہو
ہے بھوکے اور ننگوں کی کہانی داستاں میری

فتح کا یا رب یہی انجام ہونا چاہیے | مطمئن میرا دل ناکام ہونا چاہیے

صوبہ متحدہ کے انتخابات کا نتیجہ

۲۱ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

(۱)

الیکشن نے یہ عقدہ کھول کر سامنے رکھا | نہیں اسلامیوں کی لیگ واحد نمائندہ
جو پاکستان چاہتی ہے سب اسکے نہیں قائل | جو سچ پوچھو تو پاکستان ہندوستان ہے سارا

(۲)

بہت سے قوم پرور لیگ سے ہارے مقابل میں | کوئی ان سے یہ کہدے کہ وہ شرمندہ ہوں کچھ دل میں
انہیں کیوجہ سے یہ راز دنیا پر کھلا جبکہ | ہزاروں ہیں مسلماں جو نہیں جینا کی محفل میں

مسز وجے لکشمی پنڈت کے نام

وجے لکشمی کو مبارک وزارت — ہو گئے لگتے ہیں ان کے بیان نوبت
بجا ہے عف۔ ان کو ہو ناز ان پر — دماغ ان کا ہے ہندوستان کی دولت

مئی ۱۹۴۶ء

جیل جا کے بھوک کی جھیلی مصیبت بارہا — ہم نے آزادی کی خاطر جو نہ کرنا تھا کیا
رائیگاں قربانیاں جاتی نہیں ایسی مگر — ہم دکھا دیں گے کہ کیا ایثار کا ثمرہ ملا

اے علام آباد کی فرقہ پرستی آہ آہ — لارڈ پیتھک کا مشن اور اسکو دھمکی آہ آہ
ایکلی کے راستہ کو چھوڑ کر گمرہ چلے — اس سے بڑھ کر ہند کی کیا بدنصیبی آہ آہ

کانگریس سے یہ کہتی ہے کہ تو بھی ہو گیا — گر ملا مجھ کو نہ پاکستان تو پھر دیکھنا
میں نہ ۔۔۔ سر اٹھاؤں گی خبر ہو جائے تجھے — ہو چکا شاہنشاہ پاکستان سے بنیا لیا

مصرعے

مسئلہ ہند کی آزادی کا — آخری مرحلہ پر جب آیا
لگ گئے لینے کی خبرا نہیں — ہیں بھی انکاؤں کی ابنا روقا

سہرے اور تہنیتیں

سہرا بتقریب شادی عزیزی عبد النافع پسر حاجی عبد الجامع صاحب بد

۱۱ رمضان المبارک سنہ ۱۳۴۰ھ مطابق سنہ ۱۹۲۲ء

ہے نہ غافل نہ بے خبر سہرا — دیکھتا ہے تعقد نظر سہرا

مسکرائی کھل کے ہر ایک کلی — سنئے لایا ہے کیا خبر سہرا

لگ گئے کھائی چار پھولوں کے — کیوں اُٹھائے نہ آج سر سہرا

دل میں چبھتی ہے ہر ایک ادا — روکش حسن سر بسر سہرا

پھر نہ ہو دعویٰ نظر بازی — دیکھ لے اپنے کو اگر سہرا

کس کا ڈر ہے نگاہ بد بیں کا — دیکھتا ہے ادھر ادھر سہرا

جستجو ہے کسی کی در پردہ — کھل کے کہتا نہیں مگر سہرا

کیا دیا؟ دی اگر نوید طرب — یہ تو دیتا ہے آ کے ہر سہرا

کہہ رہی ہے یہ روح ذاکرؔ کی — خوب تر لائے گا ثمر سہرا

ہو مبارک انھیں خدا سے تدبیر
خوش اعزا ہیں دیکھ کر سہرا

لہ حاجی حافظ مجاہد الدین ذاکر متولی بدایونی دلہن کے دادا کی طرف اشارہ ہے۔

سہرہ شادی و ختنہ آفتاب سلمہٗ و برادران

۴ ردسمبر ۱۹۳۳ء

نہ یہ پھولوں کا نہ ہے لعل و گہر کا سہرا
کل جذبات محبت سے ہے گوندھا سہرا

زاہرہ بی بی کے گھر خوب رچی ہے شادی
ہو گئے خوش پیاری امینہ نے گایا سہرا

بدر و مصباح و سراج آج بنے ہیں دولہا
سب سے بڑھ کر ہو ضیا بار ضیا کا سہرا

چاروں بچوں کو ہی اک ساتھ بنایا نوشاہ
رہیں مل جل کے یہ کرتا ہے اشارا سہرا

بھائی بھائی رہیں سب قوت بازو ہو کر
پھول گندھوا کے اسی واسطے لایا سہرا

انہیں ماں باپ کی آنکھوں کی ہو چاروں ٹھنڈک
چار یاران پیمبر کا ہو سایا سہرا

غسل صحت ہے جو ننھے کا خوشی ہو اس کی
عقد شادی کا بھی اور بندھے گا سہرا

وہ بھی دن ہو کہ کھلے راہ معیشت ان پر
تب جو منتی ہو یہ خوشی اور یہ سہرا سہرا

فخر اسلاف ہوں اپنے عصروں میں عزت پائیں
قابلیت کا ہو جاتا تو ہنر کا سہرا

زاہرہ بیاہ کے تب چاند سی دلہن لائیں
لطف دیگا انہیں اس وقت یہ جاتا سہرا

ہم تو کیا ہوں گے مگر سب کی زبان پر ہوگا
قابلیت کا ہو جاتا یہ ہنر کا سہرا

یہ نظامی کا دعا نامہ سنا دو ان کو
جو یہ کہتے ہیں کہ اس نے کوئی لکھا سہرا

سہرا شادی حفیظ الدین سلمہٗ

۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء

میرے بھائی کا ہے جو لختِ جگر　　قوتِ قلب و روحِ نورِ نظر
اس کی شادی کا ہے بندھا سہرا

قد ہے بوٹا سا چاند سا مکھڑا　　دل کی ٹھنڈک ہے سکھ ہے آنکھوں کا
رُخ پہ دلہن کے کھل گیا سہرا

دشمنوں کی لگے نہ ان کو نظر　　رہیں دولہا دلہن یہ شیر و شکر
راس آئے یہ اے خدا سہرا

بن کے دولہا حفیظ جب آئے　　ہو کے خوش یوں نصیر بول اُٹھے
منجھلے بھیّا کا دل رُبا سہرا

خوش نما خوش ادا ہے خوش منظر　　کہتے ہیں اس کو دیکھ کر اکبر
بھائی صاحب کا واہ وا سہرا

رو کی دہلیز تینوں بہنوں نے　　نیگ مل جائے تو دلہن آئے
پھر ہو بچّا حفیظ کا سہرا

نور کی جگ میں روشنی پھیلے　　فخرؔ کا نام تا ابد چمکے
کے آیا یہ مدعا سہرا

ترو تازہ شجر ولی[۱] کا یہ ہے — شاخ میں شاخ اک نئی پھوٹے

یہ کرامت دکھائے گا سہرا

میرے بھائی رہیں مدام نہال — سال بھر بعد دیکھیں لعل کا لال

مانگتا ہے یہی دعا سہرا

بھائی کو دل کی ہے مراد ملی — ہے نظامی کو بھی خوشی سے خوشی

فرط الفت سے ہے لکھا سہرا

قطعہ تہنیت شادی
عبدالنافع خلف حاجی بدایونی

جون سنہ ۱۹۲۱ء

محبت بنا ہے محبت بنی ہے — محبت کی دلھن پیا یہ شادی بنی ہو

محبت، محبت، محبت، محبت — یہی زندگی ہے یہی زندگی ہو

فرشتہ بنا ہے محبت کا دولہا — دلہن حسن دلکش کی دیوی بنی ہو

بنا اور بنی ہیں محبت کے پتلے — تماشا محبت کا یہ دیدنی ہو

ہو ذرہ نشیں سہرے کو راہِ محبت — کرے گا وہ طے گرچہ منزل کڑی ہو

۱؎ ولی الدین پدر نوشہ۔

نام ہے ان کا بنا یہ خانداں بھر منیر
دولہا اور دلہن کے گھر میں ہو انھیں کی روشنی

دیکھ کر انور کا سہرا کیسی خوش ہیں نانی جان
نور آنکھوں کا بنا ہے دل کی ٹھنڈک ہے بنی

زہرہ بیگم کو مسرت کیوں نہ ہو جائے فزوں
آج آ کے ہو گئی تھی کل جو بیٹی بھائی کی

دیکھی بھالی پیاری پیاری رونقِ آئینہ ہو
کہتی ہیں انور کو میرے چاند سی دلہن ملی

تم کو اے شہزادہ صد شاباش اور صد آفریں
اپنی ہمشیرہ کی تم نے خوب کی ہے دل دہی

دل جو ٹوٹا ہوا جوڑا ہے رشتے سے اسے
تھی یہی شرطِ اخوت دیکھ تھی یہ ہی!

ہے یہ تقسیم مختصر شہزادہ اور زہرہ کی نذر
وہ کسی کی یاد سے ممنون ہو کر ہے لکھی

داد کا طالب نظامی ہے غلط بالکل غلط
سیدھی سادھی تہنیت ہے یہ کب ہے شاعری

قطعہ تاریخ

آرزو زہرہ کو اک مدت سے جس سہرے کی تھی
شکر خالق کا ہوئی ہے وہ تمنا بار ور
مصرعۂ تاریخ برجستہ نظامی نے کہا
اب بندھا سہرا وہ فرقِ انورِ مسعود پر

۱۳۷۶ھ

دعا نامہ نظامی

قطعہ تہنیت تقریب عقد برخوردار حبیب احمد سلمہ

۲۸ مئی سنہ ۱۹۴۳ء یوم جمعہ

ہے چمن میں نسیم کی آمد — ہے امینہ کے گھر بہار آئی
وہ امینہ حبیب احمد کا حبیب — وہ امینہ نظامی کی جائی
ہے یہ پیارے حبیب کی شادی — اس خوشی میں ہے بزم آرائی
ہیں حلیمہ بھی خوش امینہ بھی — بات دونوں نے مل کے ٹھہرائی
بہنیں ہیں پہلے اب ہوئیں سمدھن — ہو مبارک نئی شناسائی
جوڑا دونوں نے یہ نیا رشتہ — باامید محبت افزائی
ہے نسیم و حبیب کا یہ قِران — نیک ساعت خدا نے دکھلائی
سر پہ مقیش کا بندھا سہرا — جس کے ہیں مہر و مہ تماشائی
یہ حلیمہ کے گھر سے آیا ہے — حلم کی شان ساتھ میں آئی
تازہ پھولوں کے ہار گردن میں — جس کی خوشبو دماغ پر چھائی
چاروں بہنوں[1] کو ہے خوشی ہی خوشی — عمر بھر کی یہ آرزو پائی
ہنس رہی ہیں حلیمیں اور پرویز[2] — آج دولہا بنے ہیں بھائی

---

[1] کشور، نور، فرحت اور نصرت نوشاہ کی چاروں بہنوں کے نام ہیں۔

[2] پرویز کا انتقال ہوگیا (نومبر سنہ ۱۹۴۵ء)

خالہ بیوی کو آج سہرے میں
اک مسرّت نئی نظر آئی
خالو صاحب کی کیا خوشی ہو بیاں
ہو انھیں کی یہ کارفرمائی
کہا صغرا نے یوں امینہ سے
کیا بھو چاندسی ہو ہاتھ آئی
کہہ رہے ہیں معتین سے یہ اجید
ہے تمھیں سے یہ محفل آرائی
ہو نظامی کا یہ دعا نامہ
نہیں بر کار خامہ فرسائی

سہرا تقریب شادی برخوردار ضیاء الحسن آفتاب سلمہٗ

۱۴ دسمبر ۱۹۴۴ء

جھلک رہا ہو مرا آفتاب سہرے میں
ضیا کا عکس ہو کیا لاجواب سہرے میں
خدا کرے کہ فلک کی اُسے نظر نہ لگے
جھلک رہا ہو کسی کا شباب سہرے میں
مشام جان میں معطر صدا یہ آتی ہے
ہیں پھول گوندھے گئے بے حساب سہرے میں
ہو حمد اس کا وظیفہ حمید اس کا لقب
ہو خاندان کا بھی انتساب سہرے میں
بنے بنی کی جو ہوتی ہیں پیار کی باتیں
چھپی ہوئی ہو وہ ساری کتاب سہرے میں
سنا ہو پڑھ کے وہ سعدی کی گلستاں آیا
لکھا ہوا ہو محبت کا باب سہرے میں
دلہن کو دیکھے نظر بھر کے کس طرح نوشاہ
حجاب سہرے میں ہو اور نقاب سہرے میں
ہر ایک شعر میں مستی کی ہو ادا پیدا
ملائی پیر مغاں نے شراب سہرے میں

ہے دوستوں پہ کرم کی نگاہ سہرے کی　　معاندوں کیلئے ہے عذاب سہرے میں
خوشی ہے باپ کو ماں کی خوشی کا کیا کہنا　　خوشی کی لہروں سے ہے اضطراب سہرے میں
نہ پوچھیں آپ نظامی کے جذبۂ دل کو
چھپا ہوا ہے وہ عالی جناب سہرے میں

قطعات تہنیت بتقریب شادی برخوردار ضیاء الحسن آفتاب

۱۴ / دسمبر ۱۹۶۱ء

صف ماتم نہیں محفل ہے جمی شادی کی　　نوحۂ غم نہیں، ہے نغمۂ شادی کی گھڑی
زاہرہ[1] مت کہو وہ قصۂ غم کو بھولیں　　شکر خالق کا کریں چاند سی دلہن ہے ملی

زاہرہ ساس ہوئیں رتبۂ عالی ہے ملا　　جو بہو ان کو ملی پیاری ہو لڑکی سے سوا
جو بہو ساس کے دنیا میں ہیں قصے مشہور　　ان سے وہ دور رہیں ہے یہ نظامی کی دعا

ان جھگڑوں سے زاہرہ رہے دور　　سا سیں جو روا رکھتی ہیں مشہور
ماں بن کے وہ لائی ہے بہو کو　　خاطر دل سے ہو اس کی منظور
ساس بنا ہو مبارک زاہرہ　　ماں کو یہ رتبۂ تمہاری کب ملا
دیکھتیں شادی تمہارے بھائی کی　　ان کی قسمت میں نہ تھا ایسا لکھا

---

[1] بنت نظامی والدہ ضیاء الحسن آفتاب

سہرے اور سہرا سہری کا مکالمہ

سہرے میں اور سہرا سہری میں تھا مکالمہ
دولہا دولہن کا پوچھ رہی تھی اتا پتا
میں نے کہا کہ ایک چمن کے ہیں دونوں پھول
دولہا بھی ہے حمیدہ دولہن بھی حمیدہ یہ

سہرے کو رات دیکھ کے بولی سہرا سہری
میرے طفیل میں ہے یہ شادی رچی ہوئی
سہرے کا تھا جواب کہ ہم دونوں ایک ہیں
سہرے سہرا سہری میں ہے نام کو دوئی

کہنے لگی سہرا سہری صورت تو دیکھئے
قامت کا فرق دیکھئے قیمت کو دیکھئے
سہرے نے یہ سنا تو وہ شرما کے رہ گیا
بس یہ کہا کہ میری رفاقت تو دیکھئے

سہرے سے ہنس کے کہنے لگی یوں سہرا سہری
کیا خوب آپ اور رفاقت کے مدعی
دو دن بھی آپ ساتھ نہ میرا نبھا سکے
میں تو رہوں گی عمر بہ جھنیوں چھپی ہوئی

سہرے سہرا سہری کی یہ جب نوک جھونک سنی
شادی جھپٹ کے بولی یہ ازراہ ثالثی
دولہا دولہن کا دونوں کا سہرا بنا ہوا ہے
زینت فقط دولہن کی ہے بنتی سہرا سہری
دونوں کا تھا جواب کہ ہاں بات ہے یہی
ثالث نے جو کہا ہے وہ ہے امر واقعی
امر مسلمہ یہ ہوا پھر یہ فیصلہ....
شادی کی جان سہرا ہے اسکو ہے برتری

سہرا تقریب شادی خانہ آبادی فاروق محشر بدایونی سلمہ

مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۴۵ء

دلہن کے روئے مصفا کا آئینہ سہرا ہے اس کو فخر کہ محشر کے سر چڑھا سہرا
وہاں وہ حسن کے نشے سے مست متوالا یہاں خمارِ محبت سے جھومتا سہرا
جھلک رہی ہے سراسر یہ محفلِ شادی بنا کے لائی گلِ تر کا ہے صبا سہرا
نہ پوچھئے کہ کشش کیا ہے اسکی لڑیوں میں کھبا ہے آنکھوں میں اور دل میں ہے بسا سہرا
پڑا وہ چہرے پہ جس دم لجا گیا دولہا کہا یہ آنکھوں نے ہے بن گیا حیا سہرا
جو چھیڑتے ہیں سر بزم اس کو ہنس ہنس کر ہے چپکے چپکے انہیں کچھ سنا رہا سہرا
نہ ہو الجھن کوئی غم دونوں خوش رہیں باہم عروس و نوشہ کو دیتا ہے یہ دعا سہرا
یہ بزمِ علم ہے اک نوجوان شاعر کی لکھیں گے آج بڑے اساتذہ سہرا

ہیں اس میں ناز بھی انداز بھی ہیں شوخی بھی
نظامی آپ کا سہرا ہے دلربا سہرا

سہرا شادی برخوردار اکبرالدین ابن محمد ولی الدین سلمہ

۱۳ اپریل ۱۹۴۵ء بروز جمعہ

محبت جس کو کہتے ہیں ہے اس کا گیان سہرے میں ہے الفت نام جس کا اس کا ہے طوفان سہرے میں

جیسے دنیا سمجھتی ہے جوانی کی کڑی منزل — وہ منزل ایکدم ہو جاتی ہے آسان سہرے میں

وہی گل جو چمن میں مسکراتے اور ہنستے تھے — سمایا عیش بن کر ہو گئے حیران سہرے میں

جو اصغر بھائیوں میں ہے اسی اکبر کی شادی ہے — ہوئی اللہ اکبر کی نمایاں شان سہرے میں

خدا نے دن دکھایا الحمد للہ ان کا بنا دولہا — مرے بھائی کے پوشیدہ تھے سب ارمان سہرے میں

مبارک ہو یہ ساعت عقد کی دولہا کو دلہن کو — وفاداری کا ہے باندھا گیا پیمان سہرے میں

ہیں بہنیں خوش تو بھائی بھی مجسم بن گئے شادی — نظر آتا ہے سب کو عیش کا عنوان سہرے میں

بنے بھیا سہرا تو خوش ہیں کہا بہنوں نے بچوں نے — ہیں ہاں جان بھابی میں ہیں اماں جان سہرے میں

نظامی نے پروئے ہیں مضامین طرب کیا کیا
مکمل عیش و عشرت کا ہوا دیوان سہرے میں

دعا نامہ از نظامی

بتقریب شادی برخوردار سراج الحسن قیصر جہاں سلمہ

۱۸ دسمبر ۱۹۳۶ء یوم جمعہ

ہے رسم کہن پھر بھی ہر دم نئی ہے — یہ شادی ہے کیا چیز کچھ آگہی ہے

قضا و قدر کا کرشمہ ہے شادی — جو ہیں اثر قدرت کے وہ جانتی ہے

یہ دنیا کی رونق یہ دنیا کی چہل پہل — یہ شادی کا بل ہے جو دنیا کھڑی ہے

یہ دنیا کے دھندے ہیں دنیا کی رسمیں — سراج الحسن کی جو شادی رچی ہے

مبارک سلامت کا ہے شور گھر میں — کہ بنتِ اجیہ آج دلہن بنی ہے

مری زاہرہ کا جو ہے پھول دولہا | تو دلہن بھی میرے چمن کی کلی ہے
پہن کے آج یہ آج سہرا بھی بنے ہیں | نئے رشتہ سے کچھ نئی خوش دلی ہے
ہے چھوٹی بہن سے بھی ایسا ہی رشتہ | نظامی کے دل کی تمنّا یہی ہے
ہوں جس گھر میں چھائے محبت کے جلوے | مسرت کی ضامن وہی زندگی ہے
اخوت کے مل جل کے دکھلائیں جوہر | روا داریاں ہی میں حقیقی خوشی ہے
سنیں گوش دل سے بہن اور بھائی | دعاؤں کی اس نظم میں چاشنی ہے

نظامی کے جذبات کا ہے یہ نقشہ
دعا نامہ ہے اس میں کب شاعری ہے

مبارکباد تقریب شادی عقد عزیزی سید محبوب سلمہ فرزند اکبر سید محمود صاحب وزیر ترقیات گورنمنٹ بہار

۱۹ مارچ ۱۹۴۷ء

(از نظامی بدایونی)

محبوب پیارا پیارا ہے سجا ہے سہرا | ماں باپ کی خوشی کا ہے آج کیا ٹھکانا
محمود سے ہے کہتا یا صدا دیب نظامی | بن جائیں آپ میرے کچھ دیر کو بیانی
بیگم سے اپنی کہہ دیں یہ سکھ گھڑی بہار کی | آئی دلہن جو گھر میں ہو وہ بڑی مبارک
ہم ساس بن کے جس کو لائیں اب ہے بیٹی | محبوب کی حبیبہ ہے آپ کی دلاری

ہو ساس اور بہو کا نازک سا ایک رشتہ — جس گھر میں ساس بہو ہاں جنت کا ہو نمونہ
دلہن ہے بہو ہاں اگر تم اس کی غلیق دیکھو — وہ دن خدا دکھلائے پوتے کو تم کھلاؤ
محمود بھی رہیں خوش جوان کا تم بیاہ پایا — اللہ نے انہیں ہے سب کا بڑا بنایا
وہ اپنے خاندان کے اور اپنی قوم کے ہیں — یونہی رہیں ہمیشہ یا اور سب کے حامی

وہ جان و دل سے ہیں بے شک ہیں ہند کے فدائی
ان خوبیوں پر ان کی قربان ہو نظامی

فلسفۂ شادی

۵ جون سنہ ۱۹۲۷ء

ناظم مرحوم کی آخری نظم جو انہوں نے قیصر جہاں کی شادی کے لئے ۵ جون سنہ ۱۹۲۷ء کو یعنی اپنے مرنے سے تین روز قبل حالت بیماری میں لکھی تھی۔

یہ نظم ہے آخری ہماری — نکتے اس میں ہیں بھاری بھاری
شادی کا ہے فلسفہ نرالا — پہلے والوں نے خوب سمجھا
بی بی زینب اور ان کی آل — امت کی ہیں آج بھی نگہبان
حال ان کا پڑھو تو راہ پاؤ — سب کو وہی راستہ دکھاؤ
دولھا دولہن کو ہے یہ کہنا — شادی یہ نہیں ہے اک معما
جس سے ہوں تعلقات پیدا — ان سے مغضوب ہو نہ جانا

ماں باپ عزیز و اقربا کو — سب کو درجہ بدرجہ دیکھو
اس نکتہ کو بھولے تو غضب ہے — ناکامی کا بس یہی سبب ہے

اب یہ اشعار دل کا جذبہ
پیارا نظامی ادب کہے گیا

تعزیتی نظمیں

رفیقہ زندگی کی وفات پر

جون ۱۹۱۳ء

اے حسین بلبل وفا میری رفیق زندگی
اتنی جلدی جانے کی کیوں دل میں اپنے ٹھان لی

بے رخی بیگانگی پہلے کبھی شیوا نہ تھا
مجھ سے گر روٹھی تھیں تو بچوں نے کیا کی تھی خطا

بیکسی میں کس پہ چھوڑا مجھ کو سمجھائیے
قصد کیا کچھ تو کہئے کچھ تو ایما کیجئے

کیوں کفن میں منہ چھپایا مجھ سے تو پردہ نہ تھا
کیا تمہارا چاند سا مکھڑا کبھی دیکھا نہ تھا

کچھ تو معلوم مجھ سے کیوں ہوئی ناراضگی
کیا دیا میں نے کوئی دکھ کچھ بتاؤ تو سہی

عمر بھر میں ایک دن پیش آیا ایسا واقعہ
جس نے تم کو دکھ دیا اور مجھ کو رنجیدہ کیا

تھی یہی رنجش کہ جس سے داغ بیکاری ملا
یاد کیا تم کو نہیں ہے وہ برا سا واقعہ

خانہ داری کے مصارف میں تمہیں دقت رہی
تنگ آکر تنگدستی کی شکایت مجھ سے کی

تھی نہ زمینداری سے آمد اور نہ کوئی نوکری
بس گذر اوقات اپنی قرض اور زیور پہ تھی

ہاتھ میں اخبار تھا کہنے کو میں بیکار تھا
ایسی بیکاری تھی جس میں ہاتھ خالی ہی رہا

تم نے غصہ سے کہا اخبار کیا اخبار ہے
ہاتھ میں پیسہ نہ آئے وہ کوئی بیوپار ہے

جب یہ باتیں سن چکا میں آنولہ جا کر تھا
بے خبر رکھا تمہیں اور ساتھ بچوں کو لیا

جب نہ پایا تم نے بچوں کو قیامت کی بپا
دل میں پچھتائیں کہ میں نے کیا کہا اور کیا ہوا

آنولہ جانے کی تو یہ ہو گئی تم کو خبر
بھیجا آغاجان[1] کو لائیں منا کر مجھ کو گھر

ان کے کہنے سننے سے بچوں کو واپس کر دیا
ریل پر جا کر مگر میں نے اٹھا وہ کا لیا

---

[1] منشی آغاجان مالک کنور ریپریس بدایوں کی طرف اشارہ ہے جن کی شرکت میں جون ۱۹۱۰ء میں ...

وہی دن تھا کہ میں آمادہ میں ابھی مہمان تھا
کیا بتاؤں میں کہ کس مضمون کی تحریر تھی
تم نے لکھا تھا کہ یوں پردیس کا جانا کیا
خود چلی آؤں گی میں ورنہ مجھے لے جائیے
کیا بتاؤں میں کہ اس خط کا ہوا تھا کیا اثر
جب بدایوں آ گیا لاہور کا ایک خط ملا[1]
تب کہا میں نے آمادہ کا نہیں کچھ تذکرہ
بولیں لو یہ بات سن رہی تھیں جو ہماری گفتگو
شوق کیوں پردیس کا ہو کیا یہاں روزی نہیں
اُن کا لہجہ تھا نہ رنگا نہ ہوا اس کا اثر
تم نے فوراً ہی کہا کوئی اگر میری سنے
ہو کتابوں کی تجارت اور پریس اپنا چلے
رفتہ رفتہ چھاپہ خانہ کا ہوا پھر انتظام
بات جو سوچی تھی تم نے وہ عمل میں آ گئی
اسی فراغت اور اسی حالت میں گزرے آٹھ سال
ایسی بیماری لگی جو جان لے کر ہی ٹلی[2]

ڈاک جب آئی تمہارے ہاتھ کا اک خط ملا
اس میں غصہ اور محبت کی ملی تھی چاشنی
ساتھ لے جاتے مجھے تو کون تم کو روکتا
تھے جو بچے روتے ہیں ان کو نہ اب تڑپائیے
چاہتا تھا اُٹھ کے پہنچوں تجھ کو گھر لاؤں یہ
تھا بلاوا اور اس کے ساتھ زادِ راہ تھا
تھے سامان سفر اب ہو سفر پنجاب کا
مجھ سے تو پوچھے کوئی کچھ راز مجھ سے تو کہو
یہ نہیں ممکن کہ تم دونوں کو جلنے دوں کہیں
دل میں یہ سوچا کہ اب نکلی ہی تو جتنے کا گھر
چار پیسے بھی ملیں گھر پر گذر ہونے لگے
ہو اگر اخبار تمہارا ملکیت اپنی رہے
دس مہینے بھی نہ گزرے تھے بنا سارا نظام
روزمرہ کے مصارف کی نہ اب تکلیف تھی
[3]ہنستے بستے میں تمہاری آ گیا اک دم زوال
تھی جو معمولی حرارت رفتہ رفتہ بڑھ گئی

۱؎ اس خط کا ذکر ذوالقرنین مورخہ ۱۰/ اگست ۱۹۰۴ء میں ہے ۲؎ اپنی خوشدامن کی طرف اشارہ ہے
۳؎ رسالہ ۱۹۰۵ء میں نظامی پریس جاری ہوا اور منشی آغا جان مالک کشور پریس ذوالقرنین سے علاحدہ ہو گئے
(باقی صفحہ ۱۵۰ پر)

مجھ سے جاتے وقت تم نے کچھ کہا تو یہ کہا
دل کو رنجیدہ نہ کرنا تھا یہی حکم خدا

عیش و اطمینان کا عالم رہا اکیس سال
کیا خبر تھی ایک دم چھا جائیگا حزن و ملال

ایک ساعت میں خدایا ہو گیا یہ کیا سے کیا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

بولیں سن لو مجھ سے کیا اس خواب کی تعبیر ہو
ہے یہ دنیا ہیچ اس کی ہیچ ہر تصویر ہو

زندگی فانی تھی وہ آنی تھی جلتی بجی
جانے والی چیز کا غم بات کب ہو عقل کی

میرے مرنے کا جو غم دانائی کا شیوہ نہیں
صبر کرنے کے سوا انسان کو چارہ نہیں

میرے بچے رو رہے ہیں اب سنبھالو انکو تم
ان سے دل بہلاؤ اپنا دیکھو بھالو ان کو تم

خانہ آبادی اگر چاہو تو دیتی ہوں دعا
آنچ بچوں پر نہ آئے بس یہی ہے التجا

خوش رہو گے تم اگر رکھو گے علمی مشغلہ
دار فانی سے نظر آجائے گی راہ بقا

محمد مبین نازش بدایونی کی یاد

۲۸ جولائی ۱۹۳۶ء

نازش سحر میں گھر سے جو باہر سفر گئے
کہتے تھے یار دوست کہاں ہیں کدھر گئے

آئی خبر وہ کل تو بریلی میں تھے مقیم
دہرہ میں جا کے آج جہاں سے گذر گئے

ایضاً

اس قدر روٹھ گئے اپنے وطن سے نازش
دامن کوہ میں یوں منہ کو چھپایا تم نے

۵ جنوری ۱۹۱۳ء میں ملاقات شروع ہوئی۔ ۵۵، رجب ۱۳۹۱ھ کو تاریخ انتقال ہے تاریخ پیدائش ۱۲ ربیع الثانی
مطابق ۲۹ مئی ۱۸۷۴ء بمقام مؤ رانی پور ضلع جھانسی

لڑکے اُستاد جو کہتے تھے بگڑ جاتے تھے
چھیڑ کر اُن کو مزا کیوں نہ چکھایا تم نے

ایسے بگڑے کہ منانے سے کسی کے نہ منے
روٹھ کر ایسے گئے منہ نہ دکھایا تم نے

تم تو کہتے تھے کہ ہوشیار جہاں زندہ ہوں
ملک الموت کو بتّا نہ بتایا تم نے

تم کو آبادی سے نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی
جا کے پھر دہرہ میں کیوں شہر بسایا تم نے

نہ وہاں شعر کا چرچا نہ صحافت کا مذاق
ایسے ویرانے میں کیوں دل کو لگایا تم نے

لکھنؤ دہلی میں رہتے تھے تمہارے رسیے
کیا بن آئی جو یہ ویرانہ بسایا تم نے

لطف اور عیش کے جلسے نہ قمر کے جلوے
شاد و عاقی کو بھی بالکل ہی بھلایا تم نے

یاد بھولے سے کبھی آتے ہیں نہ ثاقب نہ امیر
لعل مدت سے گئے لالی کو ہی پایا تم نے

ہاتھ آیا نہیں جالب سا پرایا ہمدم
اسی باعث سے ہے راغب کو بھلایا تم نے

زندگی میں تمہیں احباب کی خاطر تھی عزیز
کبھی اخلاص بڑھا کر نہ گھٹایا تم نے

قاضی صاحب جو بریلی کے تمہارے تھے خلیل
مہرباں اُن کو ہی آخر میں بنایا تم نے

دوستی نام اسی کا ہے جو نازش سے ہے
واقعی طرزِ عمل سے یہ بتایا تم نے

نئے عالم میں نہ کیوں شاد رہو چین کرو
ایک انجمن میں فرشتوں کو رجھایا تم نے

پیٹ میں بل پڑ گئے ایسے ہنسے خوش ہو کر
لال[1] بی بی کا فسانہ جو سنایا تم نے

بے ملے اس طرح گئے اور ہمیشہ کو گئے
آٹھ آٹھ آنسو نظامی کو رلایا تم نے

---

[1] حضرت نازش نے اپنی جوانی میں ایک ناول لال بی بی لکھا تھا۔

قطعۂ تاریخ انتقال پُر ملال ہمرسید راس مسعود مرحوم مغفور

مطبوعہ ذوالقرنین ۱۰ راگست ۱۹۳۷ء

انتقال راس مسعود ایسے وقت میں / زمانے میں جب نظر آتی ہو دنیا بے ثبات

ہر قدم پہ لغزشیں ہوں پائے استقلال کو / درہم و برہم تلوّن سے ہو ساری کائنات

کام کی باتیں ہوں کم ہیں نام کی باتیں بہت / اور ہو ذاتی غرض پہ منحصر ہر ایک بات

قوم کے صدمہ میں تنہا حشر سے کچھ کم نہیں / اس زمانے میں کسی ہمدرد قومی کی وفات

آہ سید راس مسعود آہ اے ہمدرد قوم / درد قومی پاس ملت جس کی موروثی صفات

زندگی جس نے گزاری خدمت تعلیم میں / دن کو دن سمجھا نہ سمجھی رات کو اس دھن میں رات

جو نظامی فکر تاریخ کی لکھ دیجیے

انتقال جنت فردوس ہے سال وفات

سانحۂ اقبال

یوم اقبال کے مشاعرہ کی طرح پر

۲۰ اپریل ۱۹۳۸ء

یاد اقبال کی ہے شان بزرگانہ بھی / بھول جانے کی نہیں مستی رندانہ بھی

سادگی وہ تھی کہ قربان تھی صد گونہ بناؤ / ٹھاٹ امیرانہ بھی تھی وضع فقیرانہ بھی

کر دیا موت نے سکتہ کا وہ عالم طاری
کام آتی ہیں اب شورشِ مستانہ بھی

ماہرِ فلسفۂ شعر و سخن تھا اقبال
ہے کلام اس کا سیاسی بھی حکیمانہ بھی

گلِ خوش رنگ بھی اور بلبلِ خوش لہجہ بھی
شمعِ ملت بھی تھا اور قوم کا پروانہ بھی

یومِ اقبال بھی ہے مجلسِ ماتم کی بھی
جلسۂ شعر و سخن بھی ہے عزا خانہ بھی

بزمِ فارس ہی کی رونق نہ رہی اے اقبال
آج ویران ہے اردو کا یہ کاشانہ بھی

قوم کو بادۂ [illegible] کا پایا تو نے
تیرے قبضہ میں تو شیشہ بھی تھا پیمانہ بھی

لاکھ انکار ہے ہو خوب نظامی کو یقیں
غمِ ملت ہیں تو دانا بھی تھا دیوانہ بھی

غمِ جاں کاہ

بر وفات مولوی نصیح الدین صاحب

۷ اگست ۱۹۳۷ء

نصیح الدین کی رحلت ہے یا غمِ جانکاہ
پڑی ہے آج مصیبت یہ کیا خدا کی پناہ

خبر جو بار یہ آئی جنازہ آتا ہے
ہر ایک سمت سے آئی صدائے نالہ و آہ

سیاہ پوش ہے ماتم میں ہر امیر و غریب
دلوں میں درد ہے آنکھوں پہ شورِ نالہ و آہ

امیر کا وہ تھا غریبوں کا ملجا و ماوا
رہا ہمیشہ وہ اہلِ غرض کا تکیہ گاہ

کسی کا کام ہو خدمت میں آئی حاضر تھے
رہا شریف منش عمر بھر وہ صاحبِ جاہ

خلیق بھی تھا وہ خوددار و بردبار بھی تھا
وہ خود شناس خودی آشنا خدا آگاہ

خواص کیلئے وہ اک محب صادق تھا — عوام اس کو سمجھتے تھے اپنا پشت پناہ
بڑھاپے میں وہ جوانوں کے کام کرتا تھا — کچھ آدمی سے بھی بڑھ کر تھا وہ معاذ اللہ
نہ چھیڑیں اس نے تصانیف ارفع و اعلیٰ — بجائے خود ہیں جو ذوق ادب کی وہ گواہ
ہر اک ادا سے یہ اس کی صدا نکلتی تھی — کہ دل نشیں ہے فقط لا الہ الا اللہ
بغیر مانگے خدا نے اسے دیا سب کچھ — رہی تھی ایک تمنائے حج بیت اللہ
سمجھے ہوئے تھے لگان اور مالیہ کا اصول — اسی نے پائی حکومت کی پالیسی کی تھاہ
مزارعین کا بل زیر بحث ہے شاید — اٹکی ہیں اس سے توقع ہے سب کی نگاہ
جو قرضہ جات کے قانون میں ہوئی ترمیم — اسی نے سود کے کم کرنے کی نکالی راہ
اسی نے زام دوہٹ کے اصول بدلائے — کہ جس کے بننے سے ہو گئی تھی خلق تباہ
نظامی قصۂ غم تو لمبے بیاں ہوگا — دعا یہ کیجئے ختم سخن، سخن کوتاہ

غریق رحمت باری ہو وہ فنا ہو کر
بروز حشر ملے رتبہ بقا باللہ

مرحوم دوست سے دو دو باتیں

۲۲ جنوری ۱۹۳ء مطابق ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ کو مولوی محمد احمد صاحب صفائی کی وفات پر

کیوں ہمہ احمد تمہیں گذرا زمانہ یاد ہے — ابتدائے دوستی کا وہ فسانہ یاد ہے
سچ بتانا یاد ہے تم کو زمانہ وہ ہمہ — جب ہمارا اور تمہارا تھا لڑکپن کھیلتا

اس زمانہ میں ہوا امر قوم عہدِ دوستی
ٹوٹ جائے عہد اتنا دوستی ایسی نہ تھی

وہ نوشتہ تا بہ مکتب یاریِ طفلاں نہ تھا
کم سے کم تم نے غلط یہ کلیہ ثابت کیا

دوستی بچپن کی تھی اک ننھی منی دوستی
جس طرح عمریں بڑھیں مضبوط وہ ہوتی گئی

پہلے اک رائی تھی بڑھ کر ہو گئی کوہِ گراں
پہلے اک قطرہ تھا بڑھ کر ہو گیا بحرِ رواں

جب جوانی آئی تو یہ فکر سر پر آ پڑی
دیس سے پردیس جائیں اور ڈھونڈیں نوکری

اپنی اپنی راہ دونوں لگ گئے دل تھا دکھی
ہم بریلی کو گئے اور تم جلال آباد تھے

ملنا جلنا بند تھا اور فاصلہ کوسوں کا تھا
خط کتابت کا مگر رہتا تھا جاری سلسلہ

ایک مدت تک جدائی کا یہی عالم رہا
شہجہاں[۱] پور میں پہنچکر ہو گئے پھر ایک جا

ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا ساتھ تھا کھانے کا لطف
ساتھ ہی تھا روزمرہ سیر کو جانے کا لطف

تھے یہی ایام خوش جب سیّدِ والا ملے
خلقِ احمد کا نمونہ قوم کے شیدا ملے

کون سیّد جن کو سب کہتے ہیں مولانا طفیل
قوم کے ہمدرد قومی درد کے رسیا طفیل

مرثیہ تھا قوم کا علم و ادب کے مشغلے
انجمن کے جلسہ میں آتے تھے سب چھوٹے بڑے

انجمن کیا تھی حقیقت میں تھی اخوان الصفا
جس نے قومی ولولہ ہر دل میں پیدا کر دیا

جسم کج رفتار کو یہ رنگ کیوں بھاتا بھلا
اس کو آتا ہی مزہ اس میں کہ ڈالے تفرقا

ہم میں سب سے قبل مولانا کی تبدیلی ہوئی
رفتہ رفتہ انجمن وہ منتشر ہو کر رہی

---

۱ شاہجہاں پور سے مراد ہے۔

میں بارہا یوں آیا تم بجنور کو جاتے رہے — میں اِدھر تمہارا اور تم اُدھر تمہارے رہے
تھی کشش میری کہ تم پر بیس تو آئے وطن — تم جو آئے ہو گیا آباد یہ اجڑا چمن
تم معاون تھے مری تصنیف میں اخبار میں — بات یہ مشہور تھی احباب میں اغیار میں
جب ہوا آغاز سن انیس سو چالیس کا (۱۹۴۰ء) — کیوں خدا جانے مگر بیٹھے تھے کچھ سوچتا
تین دن تو ایسے گزرے بات کچھ ہو نہ سکی — خیریت پوچھی تھی مولانا کی پھر چپ لگ گئی
گیارھویں فروری جمعہ کی تھی اور دن تھا پیر کا — باندھ کر رخت سفر فردوس کا رستہ لیا
تم بھی تو تنہا ہیں تمہارے ساتھ اعمال حسن — ہم یقیں دکھلائیں گے جنت کا یہ ہمکو چمن
او نظامی ہیں یہاں او کس سے گفتگو — ہو مخاطب جس سے تم وہ اب کہاں ہیں یار جو

کہنے سننے بے تکلفوں کا اب موقع کہاں
ہاں یہ کہہ لو تم جہاں ہو ہم بھی آئیں گے وہاں

احسن مارہروی کی یاد

۱۴ ستمبر ۱۹۴۰ء

تم ڈھونڈھتے ہیں حضرت احسن کدھر گئے — جو دولت خلوص کے سرمایہ دار تھے
شاعر بھی تھے ادیب بھی تھے اپنے وقت کے — میدان علم و فن کے یہ شہسوار تھے
پہنچا دیا فن شعر کو بام عروج پر — جب تک اس کی فکر میں بیقرار تھے
ہوتی تھی ان کی بات نئی اور تلی ہوئی — ان کا کلام سحر تھا جادو نگار تھے

اُن کا کلام کیوں نہ ہو اُردو میں مستند — اُستادِ وقت داغ کی وہ یادگار تھے
حافظ بھی تھے وہ حاجی بیت اللہ بھی — اور اُس کے ساتھ بہت عالی تبار تھے
رہتے تھے وقف خدمتِ احباب کیلئے — وہ دوستوں کے دوست تھے یارو کے یار تھے
دل اور جگر کا حال نہ پوچھو کہ کیا ہوا — وہ چوٹ کھائے پہلے سے ہی داغدار تھے
احسن کی طرح چھوڑ گئے مجھ کو اور بھی — جو میرے ہمخیال تھے اور غمگسار تھے
کس کس کو ڈھونڈوں کس کو پکاروں کہاں گئے — زیر زمیں چھپے جو میرے رازدار تھے

خوش ہو نہ اب میں خاک نظامی بہار میں
ہر گل ہیں میرے داغِ جگر آشکار تھے

قطعہ تعزیت بر وفات اکبر شاہ محمد سلیمان مرحوم مغفور

مارچ ۱۹۴۱ء

اے نظامی لگ گئی چپ تمکو کیوں کیا سُن لیا — کل جو گذرا ہے دہلی میں غم کا سانحہ
ڈھونڈتے ہو تم سلیماں کو نئی دہلی میں کیوں — مل سکے گا اب نظام الدین میں انکا پتا
تجھ کو سونپا تھا الہ آباد نے جو اپنا لعل — ہم کو اے دلی بتادے تو نے اسکو کیا کیا
تیرے گورستان کو اس کی ضرورت کیا ہوئی — خاک میں تیری بہت مدفون ہیں شاہ و گدا
کیا چھپایا اسکو سچ مچ تو نے اپنی خاک میں — وہ امانت تھی ترا گنج گراں مایہ نہ تھا
پھیر دے ہم کو سلیماں تو ہمارا پھیر دے — اس کو بے دیکھے ہمیں اب صبر کیونکر آئے گا

مسلم کی اعلیٰ عدالت میں بڑا کہرام ہے — مہر سلیماں تھا قفس اس کو خالی کر گیا
آج دنیائے ادب بھی ہو رہی ہے سوگوار — اُس کا حامی اس کا عاشق ہو گیا اس سے جدا
ماہر سائنس تھا اُس کی ہی تحقیق تھی — قابلیت کا ہے اُسکی آج شہرہ جابجا
اُس کی کشتی جب بھنور میں آ گئی تھی یک بیک — مسلموں کی جامعہ کا وہ بنا تھا ناخدا
جامعہ کی اُس نے جو خدمات کی تھیں بے غرض — قابلِ تعریف بے شک اس کا یہ ایثار تھا
اتنی محنت اور کاوش اُس نے کی اس کام میں — رفتہ رفتہ اُس کی صحت پر اثر اس کا پڑا
اب اٹھایا جائے گا مجھ سے نہ یہ بارِ گراں — مرنے سے پہلے یہی پیغام تھا ہم کو دیا
قوم کہتی تھی سلیماں کی جدائی شاق ہے — بس اسی کے ساتھ میں پھولے پھلے گی جامعہ
جامعہ کے چھوٹنے سے قبل دنیا چھوڑ دی — تھی مشیت ہی یہی پورا نہ ہو یہ مدعا
وہ ہوا نظروں سے اوجھل کارنامے چھوڑ کر — اس کے زندہ رہنے کا دیتے رہیں گے جو پتا
کیوں سلیماں کی ثنا کرتے نہیں اہلِ جہاں — صفحۂ عالم پہ اُس کی ثبت ہے مہرِ بقا
یہ تو سب سچ ہے مگر میں دل کو اپنے کیا کروں — حال اُن کا غیر ہے اب میں انہیں سمجھاؤں کیا
فرض ہے بیگم سلیماں سے کریں ہم تعزیت — اُن پہ یہ بپتا پڑی ہے راج اُن کا لٹ گیا

اب تو بچے سامنے اُن کے ہیں اُن کی زندگی
ہے نظامی کی دعا رکھیں انھیں پھولا پھلا

زہرہ مرحومہ کا نوحہ[۱]

۱۰ر جولائی سنہ ۱۹۴۱ء

اس کا ننھا سا کھلونا لے لیا یہ کیا کیا — زاہرہ پر کیوں ستم توڑا فلک نے بے خطا

آزمائش ہے یہ بندوں کی ستم ہرگز نہیں — ہوش ہیں آ او نظامی غیب سے آئی ندا

آزمائش میں وہی پورا اترتا ہے بشر — جو زباں سے اُف نہیں کرتا مصیبت میں ذرا

صبر کرنے کیلئے ہاں عزم محکم چاہیے — صبر جو کرتے ہیں ان کے ساتھ رہتا ہے خدا

صبر اک نعمت ہے ملتی ہے خدا کے حکم سے — دیکھ لو قرآن میں ہے صبر کا درجہ بڑا

زاہرہ بی بی سے کہہ دو رونا دھونا ہے فضول — اب وہ ملنے کا نہیں ہے جو کھلونا چھن گیا

دل کرو مضبوط صبر و ضبط سے تم کام لو — پیارے بچوں کو سنبھالو عقل کا ہے اقتضا

تم جو روؤ گی تو یہ معصوم بچے روئیں گے — تم انھیں بہلاؤ تو بچے بھلا دیں سانحا

جانتی ہو تم کہ جا کر کوئی پھر آتا نہیں — جو ہوا دنیا میں پیدا ایک دن ہو گا فنا

تم کہو گی بن کھلے مرجھا گئی ننھی کلی — ہے یہی غم بھول جانے کا نہیں یہ واقعا

یہ تو سب سچ ہے مگر کچھ بس نہیں انسان کا

ہو کے رہتا ہے وہی ہوتا ہے جو حکم خدا

---

۱ زہرہ بنت قاضی قطب الحسن یعنی نظامی مرحوم کی نواسی

قمر بدایونی کی وفات پر

۱۴ر جولائی سنہ ۱۹۲۱ء

اب ہیں نازش[1] نہ حبیب[2] ہیں نہ احسن[3] باقی
ایک ایک کرکے روانہ ہوئے اپنے ساتھی
آج سنتے ہیں قمر[4] نے بھی ہیں آنکھیں پھیریں
روٹھ کے ہم سے ہوئے ملکِ عدم کو راہی
وہی رونق ہے مگر میکدۂ عالم میں
وہی مے خوار وہی خم ہے وہی ہے ساقی
بزم میں شمع وہی اور وہی پروانے
ان کا مرنا وہی جل جل کے وہی قربانی

ہیں چمن میں وہی غنچے وہی پھولوں کی مہک
بلبلیں گاتی ہوئی پھرتی ہیں ڈالی ڈالی
وہی گلزار میں صبا کا آنا جانا
بال و پر باندھنے کی ہے وہی تیاری
محفلوں میں ہیں وہی شعر و سخن کے چرچے
حسن اور عشق کا ہے ایک تلاطم جاری
مسجدوں میں ہے وہی نامِ خدا کا ڈنکا
مندروں کو وہی ناقوس نوازی پیاری

یہ تو سب سچ ہے نظامی تمہیں معلوم ہے کچھ
تم بھی فانی ہو یہ دنیا کا سماں بھی فانی

---

[1] منشی محمد مبین نازش بدایونی — وفات جولائی سنہ ۱۹۲۶ء
[2] مولوی حبیب احمد صدیقی بدایونی — " جنوری سنہ ۱۹۲۰ء
[3] حضرت شاہ سید علی احسن مارہروی — " ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء
[4] منشی قمر الحسن قمر بدایونی — " یکم جولائی سنہ ۱۹۲۱ء

فانی مرحوم کی یاد

ستمبر ۱۹۴۱ء

فانیِ غم زدہ کی رخصت ہے — وہ ہوا ہے فنا یہ شہرت ہے
اُس رحلت بھی کوئی رحلت ہے — اُس سے کہتی یہ اُس کی حسرت ہے

تو نے دار البقا کی کیوں ٹھانی
نام سچ مچ تھا جیسے ترا فانی

راز دانِ سخن ہوا رخصت — اب کہاں فنِ شعر کی شوکت
تجھ سے بزمِ ادب کی تھی زینت — غم کی دنیا میں تھی تری شہرت

تو نے دار البقا کی کیوں ٹھانی
نام سچ مچ تھا جیسے ترا فانی

تیرا ہر شعر موت کی تصویر — ہر غزل تیری درد کی تفسیر
غم میں ڈوبی ہوئی تری تحریر — تیری تخریب میں مگر تعمیر

تو نے دار البقا کی کیوں ٹھانی
نام سچ مچ تھا جیسے ترا فانی

تو اٹاوہ کبھی بریلی تھا — اکبرآباد میں کبھی پہونچا
لکھنؤ میں کبھی قیام کیا — نام ہر جا کیا بدایوں کا

تو نے دار البقا کی کیوں ٹھانی
نام سچ مچ تھا جب ترا فانی

فخر تھا تجھ کو تھا بدایونی　　تو دکن میں رہا بدایونی
تھا سراسر فنا بدایونی　　پھر کیوں آئی قضا بدایونی

تو نے دار البقا کی کیوں ٹھانی
نام سچ مچ تھا جب ترا فانی

تو بدایوں کا لال تھا نہ رہا　　تو سراپا کمال تھا نہ رہا
تو مجسم ملال تھا نہ رہا　　تو فنا کا ملال تھا نہ رہا

تو نے دار البقا کی کیوں ٹھانی
نام سچ مچ تھا جب ترا فانی

جانتا تھا کہ کیا ہو فقر و غنا　　مال و دولت کی تہہ کو تو پہونچا
رہا دنیا میں ہو کے اس سے جدا　　فلسفہ کو حیات کے سمجھا

تو نے دار البقا کی کیوں ٹھانی
نام سچ مچ تھا جب ترا فانی

تھے بدایوں میں جب تک رہنے　　خوب شعر و سخن کے تھے چرچے
وہ نظامی کو یاد ہیں جلسے　　اب نہ فانی نہ زمزمے اسکے

تو نے دار البقا کی کیوں ٹھانی
نام سچ مچ تھا جب ترا فانی

قطعہ تعزیت بسلسلۂ ارتحال مولوی اکرام عالم مرحوم

۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء

زمانہ یوں تو مجسم شر ہے کیا کہئے — نئی یہ گردشِ شمس و قمر ہے کیا کہئے

ہے اس نے دھوکے سے اکرام لے لیا ہم سے — شکایت اس سے مجھے کس قدر ہے کیا کہئے

میں اور اس سے کروں عرضِ حال اے توبہ! — وہ خود ہی غم سے مرے باخبر ہے کیا کہئے

کہیں کو روٹھ کے اکرام مجھ سے جاتے ہیں — میں پوچھوں ان سے کہ مدِّ نظر ہے کیا کہئے

ملے سفر میں تو جی بھر کے بات ہو نہ سکی — کہا یہ میں نے سرِ رہ گذر ہے کیا کہئے

وطن میں آئے تو کچھ بے خبر سے آئے وہ — نہیں جب ان کو کچھ اپنی خبر ہے کیا کہئے

وہ دارِ فانی سے دارِ بقا کو جاتے ہیں — حضر میں بیٹھے انہیں یہ سفر ہے کیا کہئے

دعا خدا سے ہے ہو بخشیں یہ خیر جنت میں — سنا ہے راہ بڑی پُر خطر ہے کیا کہئے

نظامی کو ہے یقیں صبر وجہ تسکیں ہے
مگر ہے آنکھوں میں آنسو بشر ہے کیا کہئے

قطعۂ ارتحال خواجہ صدیق حسین مرحوم اکبرآبادی

مالک ایڈیٹر "آگرہ اخبار" آگرہ (۱۱ ستمبر ۱۹۴۲ء)

تھے جو مینائے صحافت کے پرانے میگسار — آج ہے چھلکا ہوا اُن کا زندگی

تھا لقب مشہور خواجہ نام صدیق حسین | تھا صداقت ہی سے ملا ان کو سُراغِ زندگی
ان کی قسمت میں پڑے تھے خاکساری کے اصول | عرش پر پہونچا اسی باعث دماغِ زندگی
خواجہ صاحب رکھتے تھے فن طباعت میں کمال | بالیقیں [illegible] ان کا بلاغِ زندگی
مضمحل ہونے لگے جب ضعف کا عالم ہوا | رفتہ رفتہ بجھ گیا ان کا چراغِ زندگی
کشمکش سے مرنے جینے کی ملی ان کو نجات | ہو گیا آخر انھیں حاصل فراغِ زندگی

ڈھونڈنا ان کا عبث بیکار ہے ان کی تلاش | مٹ گیا جب صفحۂ ہستی سے داغِ زندگی
نقل کی جب یہاں سے عیش و عشرت ترک کر کے | اب تو ہے اُجڑا ہوا یہ عیش باغِ زندگی

دوست اور احباب اپنے داغِ فرقت دے گئے
اے نظامی اب ہوا پامال راغِ زندگی

قطعہ تعزیت منشی دیانرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" و "آزاد" کانپور

۱۷ نومبر سنہ ۱۹۴۲ء

اے فلک تو نے انتہا کر دی | باقی اب کوئی امتحاں نہ رہا
ایک ایک کر کے چن لیا سب کو | اب کوئی اپنا راز داں نہ رہا
ایک باقی نگم تھا لے دے کے | اس کا بھی لطف بیکراں نہ رہا
اب وہ رعنائی خیال کہاں | اب تصور مرا جواں نہ رہا

اشتراکِ خیال تھا اس سے ہم خیال اور ہم زباں نہ رہا
تھی دیا جس کی عام دنیا پر وہ زمانہ کا مہرباں نہ رہا
روح "آزاد" جان آزادی اُف سیاست کا نکتہ داں نہ رہا
ہو صحافت کے گھر نہ کیوں ماتم کہ ادب کا مزاج داں نہ رہا
ادبا میں بھی صف ماتم کہ ادب کا مزاج داں نہ رہا
تھا جو اپنی زبان کا ماہر حیف وہ صاحب زباں نہ رہا
بزم اردو کی اس سے تھی رونق اُس کی تزئین کا نشاں نہ رہا
نام لیوا ہیں یوں تو بہتیرے مگر اُردو کا قدرداں نہ رہا
خلق کو جو نگاہ رکھتا تھا وہ مروت کا پاسباں نہ رہا
دشمنوں سے خلوص تھا اس کو دشمنوں سے بھی سرگراں نہ رہا
جان تھی اُس کے سب ارادوں میں وہ کبھی بن کے نیم جاں نہ رہا
تھے عزیز اُس کو ہندو و مسلم فرق کچھ ان کے درمیاں نہ رہا
افتخار ہند آرزو اُس کی آہ وہ فخر ہندیاں نہ رہا
کانپور آئے جس کے ملنے کو لوگ کہتے ہیں وہ یہاں نہ رہا
وہی گھر ہے وہی در و دیوار اک فقط صاحب مکاں نہ رہا

گوشہ گوشہ سے آ رہی تھی صدا
کہ نظامی کا مہرباں نہ رہا

قطعات بر وفات محبی مولانا سید طفیل احمد مرحوم

۷؍ اپریل ۱۹۴۹ء

(۱)

لکھ لیا ہم نے طفیل آپ کی فرقت کا مزا — خوگر درد کو ہی رنج میں راحت کا مزا
ذوق تصنیف کا باقی ہے نہ تالیف کا شوق — خاک میں مل گیا سب شغل صحافت کا مزا

(۲)

ہم تو سمجھے تھے اسے زندگی بھر کا ساتھی — کیا خبر تھی کہ وہ ہے چند پہر کا ساتھی
سیر و تفریح کا ہے لطف نہ گھر رہنے کا — چھٹ گیا مجھ سے سفر اور حضر کا ساتھی

(۳)

سنتے ہیں طفیل آج ہے دنیا سے سدھارا — جو قوم کی قسمت کا بنا قوم کا تارا
اب دیکھئے کس طرح نظامی کے کٹیں دن — اک دوست تھا اس نے بھی کیا اس سے کنارا

(۴)

تسکین کی خاطر ہے فقط صبر کا یارا — باقی نہ رہا ان کی محبت کا سہارا
کچھ ایسی بنی ان پہ کہ دنیا سے گئے وہ — تھی یوں تو جدائی نہ نظامی کی گوارا

(۵)

اچھے لوگوں کی نہیں ہوتی ہے فانی زندگی — گو طفیل احمد نہیں باقی ہے ان کی زندگی

ان کی لائف چھپ کے نکلے وقت کا ہے اقتضا — وہ بتا دے قوم کو ہوتی ہے ایسی زندگی

(۲)

قومی خدمت کا ولولہ نہ رہا — اپنا خاموش رہنما نہ رہا
آج چھوڑا طفیل نے بھی ساتھ — اب تو جینے کا کچھ مزا نہ رہا

قطعہ تہنیت پیدائش دختر آفتاب سلمہ

۹ر اکتوبر ۱۹۴۶ء وقت صبح (بعد نماز فجر) یوم چہارشنبہ

ہے کبھی آنے کی شادی اور کبھی جانے کا غم — رنگ دنیا کا بدل جاتا ہے ہر دم ہر گھڑی
اک نئے مولود کا ہیں خیر مقدم کر رہے — جن در و دیوار پر اک دن اداسی چھائی تھی
آفتاب اُن کے لئے لائے ہیں ننھی سی لقا — بن گئیں بوجان دادی جان ہے کیسی خوشی
اُس کا چہرہ کہہ رہا ہو گی بچی خوش نصیب — اب معیشت کی نظر آجائیں گی راہیں کھلی
مُنے اختر عاصمہ احسن نے آکل سے کہا — ہم نہیں دیں گے تمہیں اپنی بچی چاند سی
ہے نظامی کی دعا بچی جئے اور خوش رہے — اپنی امی جان کے دل کی کھلاوے وہ کلی

آج ۱۷ر مئی ۱۹۴۶ء کو چند اشعار اور یاد آگئے جو ۱۸۹۱ء میں بحالت
طالب علمی درجہ انٹرینس جوبلی ہائی اسکول گورکھپور لکھے گئے تھے اس

• سکول میں ہر ماہ "PENNY READING" کا جلسہ ہوا کرتا تھا جس میں طالب علم ڈرامہ کرتے تھے نظمیں پڑھتے تھے تقریریں کرتے تھے جہاں تک میرا خیال ہے یہ میری پہلی نظم تھی۔

۱۴ مئی ۱۹۲۵ء

پینی ریڈنگ سکھا دیتی ہے ہم کو سب کچھ — یہ نہ کہنا کبھی ان جلسوں میں رکھا کیا ہے
کون کہتا ہے یہ تعلیم ہے ناقص تعلیم — شر ہے گر خیر ہو پیدا تو اچنبا کیا ہے
یہ ہی تعلیم بنا دیتی ہے کیسے انساں — ہم دکھا دیں گے ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے
وہ بھی دن ہوگا کبھی ہوں گے ہمیں ملک کے رکن — ہنس نا چار کا بس اور بھروسہ کیا ہے

یہ شعر میں نے جناب منشی ایشور سرن ایڈوکیٹ الہ آباد کی خدمت میں جب کہ مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے بھیجا تھا وہ میرے جوبلی ہائی اسکول گورکھپور کے کلاس فیلو تھے۔ ان کو لکھا تھا کہ میں نے بحالت طالب علمی جو پیشین گوئی کی تھی وہ آپ کے ذریعہ سے پوری نکلی۔

از مسودات نظامی

۱۱ اکتوبر میں مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر نے نظامی صاحب کو ایک خط لکھا جس میں لکھا تھا کہ آپ میرے شعروں سے سیاست کا کام کیسے لیتے ہیں اور وہ ایسے چسپاں ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اسی لئے لکھے گئے تھے نظامی صاحب نے ذیل کا قطعہ لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجا تھا۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۴۵ء

اثر صاحب کے خط کے جواب میں

ہے معنی خیز اُن کی "بہاراں"[۱] کا لفظ لفظ
کہتا ہے کون اس کی اثر کو خبر نہیں
کرتا ہوں طے میں اس سے سیاست کے مرحلے
اعجاز شعر کا ہے یہ میرا ہنر نہیں

---

[۱] نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کے دیوان کا نام بہاراں ہے۔

غزل

۲؍ نومبر ۱۹۴۶ء

مجھ کو وہ ناتواں رہنے دیں
ہاں فقط دل جواں رہنے دیں

کیوں جدا کرتے ہیں مجھے اغیار
میاں ان کا قران رہنے دیں

دیکھ لیں مہربانیاں ساری
اب کرم مہرباں رہنے دیں

حد بھی ہے کوئی مہمانی کی
تا کجے مہماں رہنے دیں

جب کہا جائے تو کہتے ہیں
کاش ہمیں یہ میزباں رہنے دیں

میں مسلّم ہوں جاں نثاروں میں
وہ مرا امتحاں رہنے دیں

ان کو کھل جائے گا مرا اسرار
میری ہستی ہی جانا رہنے دیں

میرا بدبخت نام رکھا ہے
اس میں کیا کسر شان رہنے دیں

صاف لفظوں میں کیجیے وعدہ
اپنی آپ این و آں رہنے دیں

خود زمانہ ہمیں ملا دے گا
اپنی وہ کھینچ تان رہنے دیں

کیسی دنیا میں چل رہی ہے ہوا
یوں یہ داستاں رہنے دیں

خون کے بہہ رہے ہیں جو دریا
آپ اس کا بیاں رہنے دیں

حسن ظن کی حقیقت ہے معلوم
وہ مجھے بدگماں رہنے دیں

عارضی نقش ہے جو الفت کا
کچھ تو اس کا نشاں رہنے دیں

یہ نظامی کی شعر اور طرب
شاعری کی وہ شان رہتی ہیں

پرنٹر
محمد حمید الدین ایف۔ آر۔ ایس۔ بی لندن
مطبوعہ نظامی پریس بدایوں
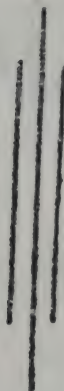
مولانا نظامی بدایونی علیہ الرحمۃ کی
چند ادبی تصنیفات

انقلاب دہلی ۔ دیوان غالب معہ شرح ۔ دیوان غالب ٹرانسلز ۔ انیس و دبیر کے پانچ مرثیے

عہ/ ۔ عہ/ ۔ عہ/ ۸/ ۔ سے/

قاموس المشاہیر اول ۔ قاموس المشاہیر دوم ۔ بدایوں قدیم و جدید ۔ کسوف الشمس ۔ تجلیات سخن

ے/ ۔ سے/ ۔ ۸/ ۔ ۴/ ۔ عہ/

انسانی اوہام ۔ رنگین و انشا ۔ قوم کی فریاد ۔ بچوں کا حساب ۔ نکات غالب ۔ مولود بہشتی

عہ/ ۔ عہ/ ۔ ۳/ ۔ ۲/ ۔ عہ/ ۔ ۲/

نظیر کا دیس پریم اردو ۔ نظیر کا دیس پریم ہندی ۔ سیاحت ولیعہد اول ۔ سیاحت ولیعہد دوم

عہ/ ۔ ۸/ ۔ ۸/ ۔ ۸/

اشرف کے ڈیڑھ سو شعر ۔ دیوان جان جاناں ۔ قومی حکومت کی کہانی ۔ مسلم اوقاف کا قانون ۔ گلدستہ دکن

۴/ ۔ سے/ ۔ ۶/ ۔ ۱۲/ ۔ ۶/

پڑھو پڑھاؤ ۔ رضیہ و مسعود ۔ ننھی صبح امید ۔ معراث انیس

۱۲/ ۔ ۱۲/ ۔ ۸/ ۔ لعہ ۔ عسہ/

نظامی بک ایجنسی کی فہرست
مفت طلب فرمائیے